۱۸۵۷ء کی تحریریں

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

شائع کردہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
خواجہ ہال، درگاہ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ
بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۳

نذر

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی

کتابوں کو

حضرت سیدہ محمودہ خواجہ بانو نظامیؒ

کی یاد

کی نذر کیا جاتا ہے

جو

حضرت خواجہ صاحب کی شریکِ حیات بھی تھیں

شریکِ کار بھی اور صاحبِ قلم بھی

یہ کتابیں خواجہ صاحب نے اپنی شادی کے بعد ہی قلم بند کیں

اور ان کتابوں کے تقریباً سبھی اڈیشن حضرت خواجہ بانوؒ کی نگرانی میں طبع ہوئے

گذرانیدہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

شمس العلماء مصور فطرت

حضرت خواجہ سید حسن نظامی دہلوی

ولادت: 2 محرم 1295 ہجری بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نئی دہلی

وفات: 10 ذی الحجہ 1374 ہجری بستی درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی

مطابق 31 جولائی 1955ء بعد نماز مغرب تدفین احاطہ خواجہ ہال

والد کا اسم گرامی حضرت خواجہ حافظ سید عاشق علی نظامیؒ

والدہ کا نام حضرت سیدہ چہیتی بیگم نظامیؒ

والدین نبیرگانِ شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ

سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ

بیگمات کے آنسو

(1857ء غدر کی کہانیاں)

خواجہ حسن نظامی

بیگمات کے آنسو (1857ء غدر کی کہانیاں)

خواجہ حسن نظامی

فہرستِ مندرجات

بیگمات کے آنسو (1857ء غدر کی کہانیاں)

خواجہ حسن نظامی

بیگمات کے آنسو (1857ء غدر کی کہانیاں)

خواجہ حسن نظامی

پیش لفظ

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا نام پیدائش کے وقت سید علی حسن نظامی رکھا گیا تھا جوانی تک وہ اسی نام سے جانے جاتے رہے، اس کے بعد شاید اختصار اور انکسار کی خاطر وہ اپنے دستخط صرف ''حسن نظامی'' کرنے لگے۔ خواجہ صاحب کے ننھیال ددھیال دونوں خواجگان چشت کے خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جدِ اعلیٰ حضرت خواجہ سید بدر الدین اسحٰق، حضرت شیخ شیوخ العالم بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے خلیفہ ہی نہیں تھے۔ بابا صاحب کی چھوٹی صاحبزادی حضرت بی بی فاطمہؒ سے منسوب اور دامادی کا شرف رکھنے والے بھی تھے اور ان کے بڑے صاحبزادے حضرت خواجہ سید محمد امام نظامی کو حضرت سلطان المشائخ کی خلافت کے ساتھ یہ امتیاز بھی حاصل رہا کہ ان کی اولاد کی شادیاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی ہمشیرہ حضرت بی بی زینب کی اولاد سے ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا، خواجہ صاحب کے مختصر نام ''سید حسن نظامی'' کے ساتھ ''خواجہ'' کا لفظ علامہ اقبال علیہ الرحمت نے خاندانی نسبت اور ذاتی کمالات کے حوالے سے اس طرح بڑھایا اور ایسا مقبول ہوا کہ وہ عام و خاص سب میں ''خواجہ صاحب'' کے نام ہی سے پکارے گئے۔

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی ظاہری تعلیم اور روحانی تربیت میں بے شمار نامور اساتذہ اور صوفی شیوخ نے حصہ لیا۔ جن میں حضرت مولانا اسمٰعیل کاندھلویؒ، ان کے دونوں بڑے صاحبزادوں حضرت محمد میاں اور حضرت یحیٰی، نیز حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے نامور پوتے حضرت پیر شاہ الٰہ بخش تونسویؒ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ گولڑہ شریف، حضرت خواجہ غلام فرید صاحبؒ، حضرت مولانا شاہ بدر الدین پھلواروی، حضرت شاہ سلیمان پھلواروی، حضرت پیر شیر محمد صاحبؒ، پیلی بھیتی اور حضرت

وارث علی شاہ صاحب جیسے اکابر کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ خواجہ صاحب ہمیشہ ان اساتذہ پر فخر کرتے رہے۔ نیز دہلی کے ایک ہندو بزرگ جو آگے چل کر خود خواجہ صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے اور غلام نظام الدین کے نام نامی سے پہچانے گئے۔ ایسے بزرگ تھے جنھوں نے بہ نفس نفیس خود تو تعلیم نہیں دی، لیکن اپنے زمانے کے ہندو ودوانوں اور روحانی بزرگوں سے خواجہ صاحب کو متعارف کرایا اور خواجہ صاحب کو ویدانت اور قدیم ہندوستانی علوم سیکھنے کی طرف متوجہ کیا اگر مہاراجہ سرکشن پرشاد نظامی صدر اعظم ریاست حیدرآباد کی روایت کو درست مانا جائے تو خواجہ صاحب نے ہندوستانی علوم اور روحانیت کو سیکھنے میں پورے بیس سال لگائے۔ خواجہ صاحب کو لکھنے کی طرف مائل کرنے اور خاص طور پر اخباروں میں مضامین لکھنے کی طرف لیجانے والے بھی غلام نظام الدین صاحب ہی تھے اور انھیں کو خواجہ صاحب کا اولین ادبی استاد کہا جا سکتا ہے۔ اگر چہ خواجہ صاحب کے رسمی پیر و مرشد حضرت پیر مہر علی شاہ بھی عالم ہونے کے ساتھ شاعر اور ادیب تھے۔ لیکن ناچیز کا خیال ہے کہ خواجہ صاحب کے بڑے بھائی حضرت حسن علی شاہ نظامی نے پنجابی زبان کے مشہور ماہر اور شاعر حضرت خواجہ غلام فرید صاحب کے پاس خواجہ صاحب کو ان کا طالب بنوایا، تو اس سے ان کا مقصد شاید یہی رہا ہوگا کہ حضرت خواجہ حسن نظامی کی ادبی تربیت حضرت خواجہ غلام فرید کے ذریعے ہو، وہ خواجہ صاحب کے والد حضرت حافظ عاشق علی صاحب کے دوست اور درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں پنجاب کے تقریباً سب ہی سجادگان کے وکیل تھے اور نئے سجادگان کی رسم سجادگی اور دستار بندی انہی سے کرائی جاتی تھی۔ حافظ عاشق حضرت خواجہ غلام فرید کے ایسے دوستوں میں رہے جن کو وہ اپنا کلام بلاغت نظام خود اپنے دست مبارک سے لکھ کر ہمیشہ ارسال کرتے رہے، نیز نجی معاملات میں دہلی میں ان کے نمائندے حافظ عاشق علی ہی تھے حضرت مرحوم کے خطوط کے ساتھ ان کا بہت سا کلام جو زمانے کی دست برد سے بچ گیا خاکسار کے پاس موجود ہے۔

حضرت خواجہ صاحب کے انشائیوں میں پنجابی اور سرائیکی الفاظ کا خوبصورت انتخاب غالباً اسی حوالے سے ہے۔ خواجہ صاحب کے ایک انشائیے

سونے دی یاد وچ چنگی

جس میں خواجہ صاحب نے ایک کشف اور پیشگوئی کی طرح اپنے مرض الموت اور انتقال کے وقت کی کیفیات کو برسہا برس پہلے ہی سچ مچ قلم بند کر دیا تھا۔ یہ حضرت خواجہ غلام فریدؒ ہی کا فیض محسوس ہوتا ہے اس پر جلا حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کے عطیے سے ہوئی خواجہ صاحب کے چھوٹے چھوٹے جملوں کے "Rhythm" کو بھی ناچیز "ماہیا" نامی صنف سخن سے جڑا ہوا اور حضرت پیر مہر علی شاہؒ کا اُلش مانتا ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی نے ہوش سنبھالا تو ایسے لوگ کثیر تعداد میں موجود تھے جنھوں نے 1857 کی دار و گیر کو بھی بھگتا اور سہا تھا۔ نیز "شہر آبادانی" اس دلی کی یادیں بھی ان کے لیے زندہ و تابندہ تھیں۔ جن کے تضاد نے ایک عجیب اور بے مثال "سیناریو" پیدا کر دیا تھا۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کی 1857 سے متعلق جن بارہ کتابوں کو ایک دفعہ پھر یکجا پیش کیا جا رہا ہے ان کے بارے میں اردو تنقید تہی دامن نہیں ہے۔ اس لئے میں یہاں اس کو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ پہلے یہ کتابیں بکھرے ہوئے موتی تھے اور اب تسبیح صددانہ کی مانند آپ کی خدمت میں اس کو پیش کیا جا رہا ہے۔ پڑھیے اور چپ! رات بھی چھوٹی نہیں اور رامائن بھی رت جگے مانگتی ہے! یہ ایک جادو بھی ہے بھلا بتائیے، ان کتابوں کے مصنف کو ہماری پرانی سرکار دولت مدار، جاتے جاتے یکم جنوری 1946 کے دن پرانے بادشاہ کو اتارنے کے ساتھ اردو کے نئے بادشاہ کو اپنی سلطنت کا آخری خطاب "شمس العلماء" عطاء کر کے گئی ہے! جادو اور کسے کہیں گے! حاکم بھی زندہ محکوم بھی پائندہ یہ سورج تو وہ ہے جو نہ اُدھر ڈوبا نہ اِدھر!

(خواجہ) حسن ثانی نظامی

مکتوب حسن نظامی بنام عبدالمجید سالک

"مخلص نواز مولانا سالک صاحب! السلام علیکم

آج سید کشفی شاہ نظامی نے خط میں آپ کی پرسش کا ذکر کیا تو میرے دل کا حال عجب ہوا۔ اس انقلاب نے (آپ کا اخبار نہیں) مسلمانوں کی زندگی برباد کردی۔ میں بہتر برس کا اندھا بڈھا یہ خیال کر رہا تھا کہ اس قبر میں آرام کروں گا جو گھر کے سامنے بنائی تھی اور اندر لیٹ کر کہا تھا کہ یہ جگہ ہے جہاں ابدی راحت میسر آئے گی۔ قبر بول سکتی تو کہتی دیوانہ ہوا ہے۔ قرآن کو پڑھ۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں مرے گا۔ ۲۰ اکتوبر ۴۷ء کو دہلی کے قتل عام کی مصیبت سے نجات پا کر نیم مردہ آٹھ دن کے فاقے میں مبتلا ہوائی جہاز سے حیدرآباد آیا۔ جب سے یہاں ہوں۔ بچے سب کئی سال سے یہاں تجارت کرتے تھے۔ بیوی بھی بچوں کے پاس تھیں۔ میں اکیلا دہلی میں مصائب کا شکار تھا۔ اب ہندیونین کو حضرت مولانا ..... صاحب نے جلسہ عام میں تقریر کر کے یقین دلایا کہ حسن نظامی حیدرآباد کو ہند سے لڑانا اور ہم سب مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ بندے ماترم' ملاپ' پرتاپ' تیج نے ایک عام طوفان میرے خلاف برپا کیا ہے۔ ۳۱ مئی کو دوبارہ میرے گھر کی تلاشی ہوئی۔ تجویز یہ ہے کہ میری جائداد اور سامان سرکاری ضبطی میں آجائے۔ یہاں دو آنے کا ایک پانی آتا ہے۔ ایک روپے کے تین پاؤ گیہوں مشکل سے ملتے ہیں۔ تاہم ہر مسلمان کا عزم قائم ہے اور اطمینان کی دولت مجھ کو بھی حاصل ہے۔

آرام گل' سون جی گوڑہ' حیدرآباد دکن"

(بحوالہ روزنامہ "انقلاب" (لاہور)' بابت ۲۰ جون ۱۹۴۸ء۔ اسی شمارے میں شذرہ بعنوان "خواجہ حسن نظامی اور حکومت ہند")

بیگمات کے آنسو

[''بیگمات کے آنسو'' غدر دہلی کے افسانوں کا حصہ اول' جس کو خواجہ حسن نظامی کی اعلیٰ درجہ کی تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء تک اس کے تیرہ ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔ بقول مصنف یہ حصہ ''محض میری ذاتی تحقیقات سے تیار ہوا ہے'' اور اس میں شامل تمام دردناک سچی کہانیاں ان کی اپنی تحریر کردہ ہیں۔۔۔مدیر]

بہادر شاہ بادشاہ کی درویشی

دلی کے آخری بادشاہ ایک درویش صفت بادشاہ گذرے ہیں۔ ان کی فقیری اور فقیر دوستی کی سینکڑوں مثالیں دہلی اور اطراف ہند میں مشہور ہیں اور دہلی میں تو ابھی سینکڑوں آدمی موجود ہیں جنہوں نے اس خرقہ پوش سلطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے ان کے درویشانہ کلام کو سنا۔

بہادر شاہ بڑے عابد بادشاہ تھے۔ ملک کے کاروبار تو سب انگریز کمپنی کے ہاتھ میں تھے' اس لئے بادشاہ کو سوائے یاد خدا اور صوفیانہ کلمہ کلام کے اور کچھ کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ دربار آراستہ ہوتا تو اس میں بھی اقلیم باطن کے حکم احکام سنائے جاتے اور شاعرانہ پیرایہ میں تصوف کے حقائق و معارف کا چرچا رہتا' چنانچہ قاعدہ تھا کہ جب درباری لوگ دیوان عام یا دیوان خاص میں جمع ہو جاتے تو حضور ظل سبحانی دربار میں برآمد ہونے کے محل سے چلنے کی تیاری کرتے۔ جونہی بادشاہ کا قدم اٹھتا' محل کی نقیب عورت آواز لگاتی ''ہوشیار ادب قاعدہ نگاہ دار''۔ یہ لال پردہ محل خاص کی ڈیوڑھی کا نام تھا' وہاں سے اس عورت کی آواز دربار کے مرد نقیب سنتے اور وہ بھی ''ہوشیار ادب قاعدہ نگاہ دار'' کا نعرہ بلند کرتے تھے' جس کو سن کر تمام درباری سمٹ سمٹا کر قرینے قرینے سے اپنے مقام پر آن کھڑے ہوتے۔ اس وقت عجب عالم ہوتا تھا کہ تمام امراء و وزراء گردنیں جھکائے' آنکھیں نیچی کئے دست بستہ کھڑے ہیں۔ مجال نہیں کوئی نگاہ اٹھا کر دیکھ سکے یا اپنے جسم کو بیکار جنبش دے۔ تمام دربار میں ایک سکتے کی حالت ہوتی تھی۔ جس وقت حضور السلطان تخلی ڈیوڑھی سے تخت پر ظہور کر چکتے تو نقیب پکارتا ''ظل الٰہی برآمد کرد مجرا ادب سے''۔ یہ سنتے ہی ایک امیر سہا سہا اپنی جگہ سے آگے بڑھتا اور بادشاہ کے سامنے ایک مقام پر جا کر کھڑا ہوتا جس کو جائے ادب کہتے تھے اور وہاں جھک کر تین کورنش بجا لاتا۔ جس وقت یہ کورنش ادا کی جاتی'

چوبدار امیر کی حیثیت اور شان کے موافق تعارف کا لفظ پکارتا اور بادشاہ کو اس کورنش کی جانب توجہ دلاتا۔ الغرض اسی طرح تمام درباری درجہ بدرجہ مجرا و کورنش کے مراسم ادا کرتے تھے۔ جب یہ تمام مراسم ادا ہو چکتیں تو حضور السلطان ارشاد فرماتے ''آج ہم نے ایک غزل کہی ہے اور غزل کا پہلا شعر فرماتے ہیں۔'' شعر سنتے ہی ایک امیر اپنی جگہ سے پھر سہما سہا جائے ادب پر جاتا اور گردن جھکا کر عرض کرتا'' سبحان اللہ! کلام الملوک ملوک الکلام'' اور پھر اپنے مقام پر آ کھڑا ہوتا۔ اسی طرح ہر شعر پر مختلف امراء جائے ادب پر جا کر حق مدح و ثنا ادا کرتے تھے۔ بہادر شاہ کا کلام ابتدا سے تصوف آمیز اور حسرت خیز تھا جس سے بوئے درد و عبرت آتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے شگفتہ مضامین میں بھی مایوسی و اداسی کی جھلک نظر آتی ہے۔

بہادر شاہ مرید بھی کرتے تھے اور جو شخص مرید ہوتا پانچ روپیہ ماہوار اس کے مقرر ہو جاتے تھے' اس لیے کثرت سے لوگ ان کے مرید ہوتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ بہادر شاہ کو حضرت مولانا فخر صاحبؒ سے بیعت تھی' مگر حضرت مولانا صاحب کے زمانے میں بہادر شاہ کم سن تھے۔ خیال نہیں ہوسکتا کہ اس عمر میں بیعت کی ہو گی۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ ایام طفولیت میں ان کو حضرت مولانا صاحب کی گود میں ڈالا گیا تھا۔ حضرت مولانا صاحب کے وصال کے بعد آپ کے فرزند حضرت میاں قطب الدین صاحب سے بہادر شاہ کو بہت فیض پہنچا ہے' بلکہ صحیح یہ ہے کہ بیعت بھی آپ ہی سے ہے۔ میاں قطب الدین صاحب کے صاحبزادے میاں نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب سے بھی بادشاہ کو خاص عقیدت تھی یہاں تک کہ اپنی لڑکی میاں کالے صاحب کو بیاہ دی تھی۔ بہادر شاہ کو یوں تو فقیروں اور درویشوں سے ملنے کا شوق تھا اور درویشی میں بصیرت کامل رکھتے تھے' مگر حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے ان کو دلی لگاؤ تھا۔ حضرت کے مزار مبارک پر اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ میرے نانا حضرت شاہ غلام حسن چشتی سے بہادر شاہ کو دوستانہ عقیدت تھی۔ نانا صاحب اکثر قلعہ میں جاتے اور بہادر شاہ کی خاص خلوتوں میں شریک ہوتے تھے۔ میری والدہ ماجدہ بہادر شاہ کے صدہا قصے اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ غلام حسن چشتی کی زبانی بیان فرمایا کرتی تھیں' جن کو سن کر بچپن میں جب کہ مجھ کو بہادر شاہ کی عظمت و شان کی کچھ سمجھ اور خبر نہ تھی' خود بخود متاثر ہوتا تھا اور دل پر دنیا کی بے ثباتی کے نقش جمتے تھے۔

بہادر شاہ صاحب باطن اور بڑے عارف تھے۔ انہوں نے غدر سے پہلے تمام واقعات غدر کو مکاشفہ سے معلوم کر لیا تھا' مگر رضائے الٰہی پر شاکر تھے' چنانچہ جس زمانہ میں حضرت شاہ اللہ بخش صاحب چشتی سلیمانی تونسویؒ پہلی مرتبہ دہلی تشریف لائے تو بہادر شاہ نے قلعہ میں آپ کی دعوت کی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تخلیہ کیا گیا اور بادشاہ نے حضرت صاحب تونسوی سے اپنی سلطنت کی کمزوری کا غیبی سبب دریافت کیا۔ حضرت صاحب تونسوی نے فرمایا کہ میرے خیال میں تمہارے بزرگوں سے کچھ خطائیں سرزد ہوئی ہیں جن میں سب سے بڑی یہ ہے کہ عاشق و معشوق کے آگے حجاب ڈالا گیا یعنی حضرت محبوب الٰہیؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے مزارات کے بیچ میں محمد شاہ بادشاہ کو دفن کیا گیا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے مابین جو محبت تھی' اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان دونوں حضرات کے مزارات کے درمیان کوئی حجاب نہ کیا جاتا کیونکہ حضرت محبوب الٰہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر شریعت کا قدم درمیان نہ ہوتا تو ہم اور خسرو ایک قبر میں رہتے۔ ایسی صورت میں محمد شاہ کو بیچ میں دفن کرنا بہت برا ہوا اور تباہی سلطنت پر پڑی۔

نانا صاحب فرماتے تھے کہ بہادر شاہ پر اس بیان کا بہت بڑا اثر پیدا ہوا اور انہوں نے اس پر دل سے یقین کیا۔ گو ظاہری و باطنی اعتبار سے ان کے نزدیک زوال حکومت کے صدہا اسباب تھے جن کو وہ بارہا خلوت کی صحبت میں بیان کیا کرتے تھے۔

عرس کا جلوس

بہادر شاہ جب حضرت محبوب الٰہیؒ کے عرس شریف میں حاضر ہوتے تو بڑی کیفیت رہتی تھی۔ جب تک بادشاہ نہ آ جاتے' ختم رکا رہتا۔ جونہی ان کی سواری آتی' غل مچ جاتا کہ بادشاہ آئے۔ خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہوتے تھے مگر بادشاہ کے درگاہ میں داخل ہوتے ہی لوگ راستہ چھوڑ دیتے اور دروازے سے مزار مبارک تک ایک آدمی کے چلنے کے قابل راستہ بن جاتا تھا جس میں سے گذر کر بادشاہ پہلے مزار مبارک پر حاضر ہوتے۔ اس کے بعد محفل میں آ جاتے۔ بادشاہ کے آتے ہی ختم شروع کر دیا جاتا اور ختم کے بعد قوالی شروع ہوتی۔ بادشاہ ایک غزل سنتے۔ اس کے بعد محفل سے چلے جاتے۔ محفل سے اٹھتے وقت ایک عجیب بہار ہوتی تھی کہ جونہی بادشاہ نے چلنے کا رخ کیا' فوراً تمام میلہ کائی کی طرح سے پھٹ گیا اور دروازے تک راستہ بن گیا۔

شاہی سے گدائی اور بربادی کا زمانہ

بہادر شاہ اگر غدر کی بلا میں مبتلا نہ ہوتے تو ان کی درویشی بڑے لطف و اطمینان سے بسر ہوتی مگر بیچارے ناکردہ گناہ باغی لشکر کے وبال میں پھنس گئے اور عمر کا آخری حصہ ہزاروں مصائب میں گذرا۔

میری والدہ ماجدہ بروایت اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ غلام حسن صاحب بیان فرماتی تھیں کہ جس دن بہادر شاہ دلی کے قلعے سے نکلے تو سیدھے درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ صاحب میں حاضر ہوئے۔ اس وقت بادشاہ پر عجب مایوسی اور ہراس کا عالم تھے۔ چند مخصوص خواجہ سراؤں اور ہوادار کے کہاروں کے سوا کوئی آدمی ہمراہ نہ تھا۔ فکر و اندیشہ سے بادشاہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور گرد و غبار سفید داڑھی پر جما ہوا تھا۔ بادشاہ کی آمد سن کر نانا صاحب درگاہ شریف میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ مزار مبارک کے سرہانے در سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی حسب معمول بشرہ کو متبسم کر دیا۔ میں سامنے بیٹھ گیا اور خیریت دریافت کرنے لگا۔ جس کے جواب میں نہایت طمانیت سے بولے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کمبخت باغی سپاہی خودسرے ہیں' ان پر اعتماد کرنا غلطی ہے۔ خود بھی ڈوبیں گے مجھ کو بھی ڈبادیں گے۔ آخر وہی ہوا کہ بھاگ نکلے۔ بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں مگر ہوں اس خون کی یادگار جس میں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی حرارت ہوتی ہے۔ میرے باپ داداؤں پر اس سے زیادہ آڑے وقت پڑے ہیں اور انہوں نے ہمت نہیں ہاری مگر مجھے تو غیب سے انجام دکھا دیا گیا ہے۔ اب اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ میں تخت ہند پر تیموری آخری نشانی ہوں۔ مغلیٔ حکومت کا چراغ دم توڑ رہا ہے اور کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ پھر جان بوجھ کر خواہ مخواہ کیوں خون ریزی کراؤں۔ اس واسطے قلعہ چھوڑ کر چلا آیا۔ ملک خدا کا ہے جس کو چاہے دے۔ سینکڑوں برس ہماری نسل نے سرزمین ہند میں ہیبت و جبروت

سے سکہ جمایا۔ اب دوسروں کا وقت ہے۔ وہ حکمرانی کریں گے۔ تاجدار کہلائیں گے اور ہم ان کے مفتوح ٹھہریں گے۔ یہ کوئی رنج اور افسوس کی بات نہیں۔ آخر ہم نے بھی تو دوسروں کو مٹا کر اپنا گھر بسایا تھا۔

ان حسرتناک باتوں کے بعد بادشاہ نے ایک صندوقچہ دیا اور کہا لو یہ تمہارے سپرد ہے۔ امیر تیمور نے جب قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا تو سلطان یلدرم بایزید کے خزانے سے یہ نعمت ہاتھ لگی تھی۔ اس میں حضور سرور کائنات کی ریش مبارک کے پانچ بال ہیں جو آج تک ہمارے خاندان میں بطور تبرک خاص چلے آتے ہیں۔ اب میرے لیے زمین و آسمان میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ ان کو لے کر کہاں جاؤں۔ آپ سے بڑھ کر کوئی اس کا اہل نہیں ہے۔ لیجئے ان کو رکھئے۔ یہ میرے دل و دیدہ کی ٹھنڈک ہیں' جن کو آج کے دن کی ہولناک مصیبت میں اپنے سے جدا کرتا ہوں۔ چنانچہ نانا صاحب نے وہ صندوقچہ لے لیا اور درگاہ شریف کے توشہ خانہ میں داخل کر دیا جو اب تک موجود ہے۔ اس کے تبرکات کی ہر سال ربیع الاول کے مہینے میں زیارت کرائی جاتی ہے۔

نانا صاحب سے بادشاہ نے کہا کہ آج تین وقت سے کھانے کی مہلت نہیں ملی۔ اگر گھر میں کچھ تیار ہو تو لاؤ۔ نانا صاحب نے کہا ہم لوگ بھی موت کے کنارے کھڑے ہیں۔ کھانے پکانے کا ہوش نہیں۔ گھر جاتا ہوں جو کچھ موجود ہے حاضر کرتا ہوں' بلکہ آپ خود تشریف لے چلیں۔ جب تک میں زندہ رہوں اور میرے بچے سلامت ہیں' آپ کو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ پہلے ہم مر جائیں گے' اس کے بعد کوئی اور وقت آ سکے گا۔ بادشاہ نے فرمایا آپ کا احسان جو ایسا کہتے ہو۔ مگر اس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لیے اپنے پیروں کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا۔ زیارت کر چکا۔ امانت سونپ دی۔ اب دو لقمے محبوبی لنگر سے کھا لوں تو مقبرۂ ہمایوں میں چلا جاؤں گا۔ وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہو جائے گا۔

نانا صاحب گھر آئے۔ دریافت کیا کہ کچھ کھانے کو موجود ہے۔ کہا گیا کہ بیسنی روٹی اور سرکہ کی چٹنی ہے۔ چنانچہ وہی ایک خوان میں آراستہ کر کے لے آئے اور بادشاہ نے وہ چنے کی روٹی کھا کر تین وقت کے بعد پانی پیا اور خدا کا شکرانہ بھیجا۔ اس کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں جا کر گرفتار ہوئے اور رنگون بھیج دیے گئے۔ رنگون میں بھی بادشاہ کی درویشانہ معاشرت میں فرق نہ آیا۔ جب تک زندہ رہے' ایک صابر و متوکل درویش کی طرح بسر اوقات کرتے رہے۔

یہ وہ قصہ ہے جس میں عقلمند آدمی کے لیے عبرت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور جس کے سننے سے انسان اپنے غرور و تکبر کو بھول جاتا ہے اور جب دماغ سے تکبر کی بو جاتی رہتی ہے تو آدمی اصل آدمی بن جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

شہزادے کا بازار میں گھسٹنا

یہ دہلی جس کو ہندوستان کا دل اور حکومت کا تخت گاہ کہتے ہیں' جب آباد تھی اور لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی' آفت اور بلا میں مبتلا ہونے کو آئی تو پہلے اس کے باشندوں کے عمل میں فرق آیا۔ [illegible]

ملوکھم۔ پہلے حاکموں کے اعمال خراب ہوئے۔اس کی رعیت بھی بداعمالیوں میں پڑ گئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ راجا پر جا دونوں برباد ہو گئے۔مثالیں ہزاروں ہیں مگر ذیل میں ایک نہایت عبرتناک کہانی سنا کر میں باشندگان ہند کو عموماً اور مسلمانوں اور صوفیوں کو خصوصاً خدا کے خوف سے ڈراتا ہوں۔

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے کا ذکر ہے۔دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے اور بے پروائی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں اور فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لیے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر خدا کی یاد میں تسبیحاں پڑھ رہی تھیں غلّے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آ نکلا اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کر کے عرض کیا کہ "میاں صاحبزادو! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو۔انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ان کے بھی جان ہے۔یہ بھی تمہاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں مگر بے بس ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔تم بادشاہ کی اولاد ہو۔بادشاہوں کو اپنے ملک کے رہنے والوں سے محبت اور مہربانی برتنی چاہیے۔یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں۔ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شان بادشاہی سے دور نہیں۔" بڑے شہزادے نے جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی مگر چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے "جا رے جا۔دو ٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔تو کون ہوتا ہے ہم کو سمجھانے والا۔سیر و شکار سب کرتے ہیں۔ہم نے کیا تو کونسا گناہ ہو گیا۔" فقیر بولا "صاحب عالم ناراض نہ ہوں۔شکار ایسے جانور کا کرنا چاہیے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا پیٹ تو بھرے۔ان ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ۔بیس مارو گے تب بھی ایک آدمی کا شکم سیر نہ ہو گا۔" نصیر مرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غلّہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بیچارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا کہ "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی۔" فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑ دی خدا تیری بھی ٹانگیں توڑے اور تجھ کو بھی اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو۔"

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں۔گولے برس رہے تھے۔زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔شہر دہلی ویران اور سنسان ہوتا جاتا تھا کہ لال قلعہ سے پھر وہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی دھاوا کرتے چلے آتے تھے۔انہوں نے ان نوعمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑ ماری۔گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور یہ سب شہزادے فرش خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔گورے جب قریب آئے تو دیکھا دو شہزادے جاں بحق ہو چکے ہیں مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ایک سپاہی نے زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا۔گھوڑے کے گرنے سے

معمولی کھرنچیں آ گئی ہیں اور دہشت کے مارے غشی طاری ہوگئی ہے۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دیئے گئے اور حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ساتھ کیمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کیمپ پہاڑی پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم ہوا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

(۳)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھس گیا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو گئے۔ تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہونے لگا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

اسی دار و گیر میں پہاڑی کیمپ پر مرزا نصیر الملک رسی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہا" جائیے۔ میں نے آپ کی رہائی کے لیے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے۔ جلدی بھاگ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔"

مرزا بچارے پیدل چلنا کیا جانیں۔ حیران تھے کہ کیا کریں' لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لیے۔ چل رہے تھے مگر یہ خبر نہ تھی کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہوں گے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ زبان خشک ہو گئی۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ تھک کر ایک درخت کے سائے میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں۔ کدھر ہمارا ٹھکانہ ہے۔ اوپر نگاہ اٹھائی تو درخت پر نظر گئی۔ دیکھا کہ فاختہ کا ایک گھونسلا بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے۔ اس کی آزادی اور آسائش پر شہزادے کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ" فاختہ! مجھ سے تو تُو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے۔ میرے لیے تو آج زمین آسمان میں کہیں جگہ نہیں ہے۔"

تھوڑی دور ایک بستی نظر آتی تھی۔ ہمت کر کے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے مگر افتاں و خیزاں گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجیب سماں نظر آیا۔

ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے اور چبوترہ پر ایک تیرہ سال کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' کان لہولہان ہو رہے تھے اور دہقانی اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ جونہی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بچاری نے مرزا کو دیکھا' دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔

بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ مرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعہ سے قطب صاحب کو چلی گئی تھیں۔ مرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہو گئی ہوں گی۔ پوچھا" ملکہ! تم یہاں کہاں؟" رو کر بولی" آغا جی! گوجروں نے ہم کو لوٹ لیا۔ نوکروں کو مار ڈالا۔ اماں جان کو دوسرے گاؤں والے

لے گئے اور مجھ کو یہاں لے آئے۔ میری بالیاں انہوں نے نوچ لیں۔ میرے طمانچے ہی طمانچے مارے ہیں۔" اتنا کہہ کر لڑکی کی ہچکی بندھ گئی اور پھر کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا۔

بیکس شہزادے نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اس کو چھوڑ دو۔ گوجر بگڑ کر بولے "ارے جا۔ آیا بڑا بچارا۔ ایک گنڈا سا ایسا ماریں گے کہ گردن کٹ جائے گی۔ اس کو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں۔ لا دام دے جا اور لے جا۔"

مرزا نے کہا "چودھریو! دام کہاں سے دوں۔ میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں۔ دیکھو ذرا رحم کرو۔ کل تم ہماری رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے۔ آج آنکھیں نہ پھیرو۔ خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے۔ اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالا مال کر دیں گے۔" یہ سن کر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے "اوہو! آپ بادشاہ سلامت ہیں۔ تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے اور یہ چھوکری تو اب ہمارے گاؤں کی ٹہل کرے گی۔ جھاڑو دے گی۔ ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی' گوبر اٹھائے گی۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا اور چار چودھریوں کو اور ان دونوں شہزادے شہزادی کو پکڑ کر لے گئے۔

(۴)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں اور جس کو انگریزی افسر کہہ دیتے کہ یہ قابل دار ہے' اسی کو پھانسی مل جاتی تھی۔ ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے۔ گولیوں سے اڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اس خون ریزی سے تہلکہ تھا۔ مرزا نصیر الملک اور ان کی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے اور صاحب نے ان دونوں کو خورد سال دیکھ کر بے قصور سمجھا اور چھوڑ دیا۔ دونوں نجات پا کر ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہو گئے۔ لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی تھی اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف لایا کرتے تھے۔ چند روز کے بعد لڑکی تو ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی اور مرزا کچھ دن ادھر اُدھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے۔ آخرکار سرکار نے ان کی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی اور نوکری کے وبال سے مرزا نصیر الملک کو سبکدوشی حاصل ہو گئی۔

(۵)

ایک برس کا ذکر ہے۔ دلی کے بازار چتلی قبر کرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا' کولہوں کے بل گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں شاید فالج سے بیکار ہو گئے تھے' اس لیے ہاتھوں کو ٹیک کر کولہوں کو گھسیٹتے ہوئے راستے میں چلتے تھے۔ ان کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہگیروں کو حسرت سے دیکھتے' گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کا حال معلوم تھا' ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام مرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن

قرضے میں برباد کر دی اور اب خاموش گداگری پر گذارہ ہے۔ مجھ کو ان کے حال سے عبرت ہوتی تھی اور جب ان کا ابتدائی قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سنا تھا' یاد آتا تھا تو دل دہل جاتا تھا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا' جس کی ٹانگ میں انہوں نے غلہ مارا تھا۔ شہزادہ صاحب کا بازار میں گھسٹتا ہوا پھرنا سخت سے سخت دل کو موم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے جی کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

کیا اس سچے اور تازے قصے سے ہمارے دولت مند بھائی عبرت نہیں پکڑیں گے اور اپنے غرور و تکبر کی عادت کو ترک نہیں کریں گے' جبکہ ان کے سامنے تکبر کرنے والوں کا انجام موجود ہے۔

سب سے زیادہ مجھے مشائخ کی اولاد کو متنبہ کرنا ہے' جو مریدوں کے ہاتھ پیر چومنے سے تباہ ہو جاتے ہیں اور اپنے سامنے کسی کی ہستی نہیں سمجھتے۔ اپنے بزرگوں کی کمائی پر بھروسہ کرنا اور کچھ قابلیت نہ پیدا کرنا' انسان کو ایک دن اسی طرح ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ ہر پیرزادہ کو چاہیے کہ وہ وہ کام سیکھے جس کے سبب اس کے بزرگ پیر کہلاتے تھے۔ محض پیرزادگی کے طفیل نذر و نیاز کا امیدوار رہنا اور اپنی ذات میں نذر لینے کی لیاقت پیدا نہ کرنا حد درجہ کی بے غیرتی ہے۔ میں نے بعض مرشدزادوں کو دیکھا ہے کہ وہ بچپن سے شاہانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور مرید کو اپنے باپ کی رعیت سمجھ کر حکمرانی کرتے ہیں' لیکن جس طرح زمانہ نے دنیاوی حکومت کے تاج و تخت کو مٹا دیا اور شہزادوں سے گلی کوچوں میں بھیک منگوا دی' اسی طرح نئے زمانہ کا الحاد دینی بادشاہت یعنی درویشی کے برباد کرنے پر آمادہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تخت جنبش میں آئے اور پیرزادوں کو شہزادوں کی طرح کہیں ٹھکانا نہ ملے' اس لئے چاہیے کہ وقت سے پہلے ہم سب ہوشیار ہو جائیں اور اپنے احوال و اعمال کو درست کر کے غنیم کا دلیری سے مقابلہ کریں اور اپنی پُر امن اقلیم کو ہر طرح محفوظ و برقرار رکھیں۔

یہی میں اب کہتا ہوں اور یہی اس وقت کہتا رہوں گا جب تک زبان و قلم یاری دیں۔

☆ ☆ ☆

یتیم شہزادہ کی ٹھوکریں

ماہ عالم ایک شہزادے کا نام تھا' جو شاہ عالم بادشاہ دلی کے نواسوں میں تھا اور غدر میں اس کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ شہزادہ ماہ عالم کے باپ مرزا نوروز حیدر دیگر خاندان شاہی کی طرح بہادر شاہ کی سرکار سے سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے' مگر ان کی والدہ کے پاس قدیم زمانہ کا بہت سا اندوختہ تھا' اس لیے ان کو اس روپیہ کی چنداں پرواہ نہیں تھی اور وہ بڑی بڑی تنخواہوں کے شہزادوں کی طرح گذر اوقات کرتے تھے۔

جب غدر پڑا تو ماہ عالم کی والدہ بیمار تھیں۔ علاج ہو رہا تھا' مگر مرض برابر ترقی کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عین اس روز جب کہ بہادر شاہ قلعہ سے نکلے اور شہر کی تمام رعایا پریشان ہو کر چاروں طرف بھاگنے لگی' ماہ عالم کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایسی گھبراہٹ کے موقعہ پر سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس موت نے عجب ہراس پیدا کر دیا۔

اس وقت نہ کفن کا سامان ممکن تھا' نہ دفن کا' نہ غسل دینے والی عورت میسر آ سکتی تھی' نہ کوئی مردے کے پاس بیٹھنے والا تھا۔ شہزادوں میں رسم ہو گئی تھی کہ وہ مردے کے پاس نہ جاتے۔ سب کام پیشہ وروں سے لیا جاتا تھا جو اس وقت کے لیے ہمیشہ موجود تیار رہتے تھے۔ غدر کی عالم گیر مصیبت کے سبب کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو تجہیز و تکفین کی خدمت میں انجام کو پہنچاتا۔ گھر میں دو لونڈیاں تھیں' لیکن وہ بھی مردے کو نہلانا نہ جانتی تھیں۔ خود مرزا نوروز حیدر اگرچہ پڑھے لکھے شخص تھے' مگر چونکہ ان کو ایسا کام پیش نہ آیا تھا' اس لیے اسلامی طریق پر غسل و کفن سے واقفیت نہ رکھتے تھے۔

القصہ ان لوگوں کو اسی حیرانی و پریشانی میں کئی گھنٹے گذر گیے۔ اتنے میں سنا کہ انگریزی لشکر شہر میں گھس آیا ہے اور اب عنقریب قلعہ میں آیا چاہتا ہے۔ اس خبر سے مرزا کے رہے سہے اوسان اور بھی جاتے رہے اور جلدی سے لاش کو چارپائی پر ہی کپڑے اتار کر نہلانا شروع کیا۔ نہلایا کیا بس پانی کے لوٹے بھر بھر کر اوپر ڈال دیئے۔ کفن کہاں سے ملتا' شہر تو بند تھا۔ پلنگ پر بچھانے کی دو اجلی چادریں لیں اور ان میں لاش کو لپیٹ دیا۔ اب یہ فکر ہوئی کہ دفن کہاں کریں۔ باہر لے جانے کا تو موقعہ نہیں۔ اسی سوچ میں تھے کہ گوروں اور سکھوں کی فوج کے چند سپاہی گھر میں آ گئے اور آتے ہی مرزا اور ان کے لڑکے ماہ عالم کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد گھر کا سامان لوٹنے لگے۔ صندوق توڑ ڈالے۔ الماریوں کے کواڑ اکھیڑ دیے۔ کتابوں کو آگ لگا دی۔ دونوں لونڈیاں غسل خانے میں جا چھپی تھیں۔ ایک سپاہی کی ان پر نگاہ پڑ گئی جس نے دیکھتے ہی اندر گھس کر سر کے بال پکڑے اور بچاریوں کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اگرچہ ان فوجیوں کو لاش کا حال معلوم ہو گیا تھا' مگر انہوں نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور برابر لوٹ مار کرتے رہے۔ آخر قیمتی سامان کی گٹھڑیاں' لونڈیوں اور خود مرزا نوروز حیدر اور ان کے لڑکے ماہ عالم کے سر پر رکھیں اور بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے گھر سے باہر لے چلے۔ اس وقت مرزا نے اپنے لٹے ہوئے گھر کو آخری حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اپنی بیوی کی بے گور و کفن لاش کو اکیلا چارپائی پر چھوڑ کر سپاہیوں کے ساتھ کوچ کیا۔

لونڈیوں کو تو بوجھ اٹھانے اور چلنے پھرنے کی عادت تھی۔ مرزا نوروز حیدر بھی قوی اور توانا تھے۔ بوجھ سر پر اٹھائے بے تکان چل رہے تھے' مگر غریب ماہ عالم کی بری حالت تھی۔ اول تو اس کے سر پر بوجھ اس کی عمر اور بساط سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ شہزادہ قدرتی طور پر نہایت نازک اور کمزور واقع ہوا تھا۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ماں کے مرنے کا غم تھا۔ رات سے روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ خالی ہاتھ چلنے سے چکر آتے تھے۔ کجا یہ نوبت کہ سر پر بوجھ' پیچھے چمکتی ہوئی تلواریں اور جلدی چلنے کی قہرناک تاکید' بچارے کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ دم چڑھ گیا تھا۔ بدن پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ آخر نہایت مجبوری کی حالت میں باپ سے کہا "ابا حضرت! مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔ گردن بوجھ کے مارے ٹوٹے جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو گر پڑوں۔" باپ سے اپنے لاڈلے اکلوتے بچہ کی یہ مصیبت بھری باتیں سنی نہ گئیں اور اس نے مڑ کر سپاہی سے کہا "صاحب! اس بچہ کا اسباب بھی مجھ کو دے دو۔ یہ بیمار ہے۔ گر پڑے گا۔" گورا مرزا کی زبان بالکل نہ سمجھا اور اس طرح ٹھہرنے اور بات کرنے کو گستاخی اور بدنیتی سمجھ کر دو تین گھے کمر میں مارے اور آگے دھکا دیا۔ مظلوم مرزا نے مار بھی کھائی' مگر مامتا کے مارے لڑکے کا بوجھ بغل میں لے لیا۔ گورے کو یہ حرکت بھی پسند نہ آئی اور اس نے جبراً مرزا سے گٹھڑی لے کر ماہ عالم کے سر پر رکھ دی اور ایک گھونسا اس بیکس و ناتواں کے بھی

مارا۔ گھونسا کھا کر ماہ عالم آہ کہہ کر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔

مرزا نوروز اپنے لخت جگر کی حالت دیکھ جوش میں آ گئے اور اسباب پھینک کر ایک مُکا گورے کے کلّے پر رسید کیا اور پھر فوراً ہی دوسرا گھونسا اس کی ناک پر مارا جس سے گورے کی ناک کا بانسہ پھٹ گیا اور خون کا فوارہ چلنے لگا۔ سکھ سپاہی دوسری طرف چلے گئے تھے۔ اس وقت فقط دو گورے ان قیدیوں کے ساتھ تھے اور کیمپ کو لیے جا رہے تھے۔ دوسرے گورے نے اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر مرزا کے ایک سنگین ماری' مگر خدا کی قدرت سنگین کا وار اوچھا پڑا اور وہ مرزا کی کمر کے پاس سے کھال چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ تیموری شہزادہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور لپک کر ایک مُکا اس گورے کی ناک پر بھی مارا۔ یہ مُکا بھی ایسا کاری پڑا کہ ناک پچک گئی اور خون بہنے لگا۔ گورے یہ حالت دیکھ کر پستول و کرچ تو بھول گئے اور ایک بارگی دونوں کے دونوں مرزا کو چمٹ گئے اور گھونسوں سے مارنے لگے۔ لونڈیوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اسباب پھینک رستہ کی خاک مٹھیوں میں بھر کر گوروں کی آنکھوں میں جھونک دی۔ اس ناگہانی آفت سے گورے تھوڑی دیر کے لیے بیکار ہو گئے اور ان کی کرچ مرزا کے ہاتھ آ گئی۔ مرزا نے فوراً کرچ گھسیٹ لی اور ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ کرچ نے شانہ سے سینے تک کاٹ ڈالا۔ اس کے بعد دوسرے گورے پر حملہ کیا اور اسے بھی ذبح کر دیا۔ ان دونوں کو ہلاک کر کے ماہ عالم کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ بالکل بیہوش تھا۔ باپ کے گود میں لیتے ہی آنکھیں کھول دیں اور باہیں گلے میں ڈال کر رونے لگا۔ مرزا اسی حالت میں تھے کہ پیچھے سے دس بارہ گورے اور سکھ سپاہی آ گئے اور انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کو خون میں نہایا دیکھ کر مرزا کو گھیر لیا اور لڑکے سے جدا کر کے حال پوچھا۔ مرزا نے سارا واقعہ سچ سچ کہہ دیا۔ سنتے ہی گوروں کی حالت غصہ سے غیر ہو گئی۔ انہوں نے پستول کے چھ فیر یک دم کر دیئے جن سے زخمی ہو کر مرزا گر پڑے اور آناً فاناً میں تڑپ کر مر گئے۔ مرزا نوروز کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور ماہ عالم کو لونڈیوں سمیت پہاڑی کے کیمپ میں لے گئے۔

جب دہلی کی فتح سے اطمینان ہو گیا تو لونڈیاں دو مسلمان پنجابی افسروں کو دے دی گئیں اور ماہ عالم ایک انگریز افسر کی خدمت گاری پر مامور ہوئے۔ جب تک یہ انگریز دہلی میں رہے' ماہ عالم کو زیادہ تکلیف نہ تھی' کیونکہ صاحب کے پاس کئی خانساماں اور نوکر چاکر تھے' اس واسطے زیادہ کام کاج نہ کرنا پڑتا تھا' لیکن چند روز کے بعد یہ صاحب رخصت لے کر ولایت چلے گئے اور ماہ عالم کو ایک دوسرے افسر کے حوالے کر گئے جو میرٹھ چھاؤنی میں تھے۔ ان افسر کا مزاج تند تھا۔ بات بات پر ٹھوکریں مارتے تھے۔ ماہ عالم اس مار دھاڑ کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن بھاگنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ پچھلی رات کو گھر سے نکلے۔ پہرے دار نے ٹوکا تو کہہ دیا فلاں صاحب کا نوکر ہوں اور ان کے کام کو فلاں گاؤں میں جاتا ہوں تاکہ سویرے ہی پہنچ جاؤں۔ اس حیلہ سے جان بچائی اور جنگل کا راستہ لیا۔

چھوٹی عمر' راستہ سے بے خبر' پکڑے جانے کا خوف' عجب مایوسی کا عالم تھا۔ آخر بہزار دقت صبح ہوتے ہوتے میرٹھ سے تین چار کوس کے فاصلہ پر پہنچ گئے۔ سامنے گاؤں تھا۔ وہاں جا کر ایک مسجد میں ٹھہر گئے۔ مُلا صاحب نے سوالات شروع کیے تو کون ہے' کہاں سے آیا ہے' کہاں جائے گا۔ ماہ عالم نے اُن کو بھی باتوں میں ٹالا۔ یہاں ایک فقیر بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو ماہ عالم کی شریفانہ صورت دیکھی تو محبت سے پاس بلایا اور رات کی بچی ہوئی روٹی سامنے رکھی۔ ماہ عالم نے شاہ صاحب کو ہمدرد پا کر اپنی مصیبت کی داستان اول سے آخر تک سنائی۔ شاہ صاحب یہ کیفیت

سن کر رونے لگے اور ماہ عالم کو سینہ سے لگا کر بہت پیار کیا اور تسلی کی باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد کہا اب تم فکر نہ کرو میرے ساتھ رہو۔ خدا حافظ و ناصر ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایک رنگین کرتہ ان کو پہنا دیا اور ساتھ لے کر چل کھڑے ہوئے۔ دو چار روز تو یہ حالت رہی کہ جہاں ماہ عالم نے کہا۔ "حضرت! اب تو میں تھک گیا" تو کسی گاؤں میں ٹھہر جاتے' لیکن پھر ان کو بھی چلنے کی عادت ہو گئی اور پوری منزل چلنے لگے۔ مہینہ بھر میں اجمیر شریف پہنچے۔ یہاں ان صاحب کے پیر جو بغداد کے رہنے والے تھے' ملے۔ ان پیر صاحب کو جب ماہ عالم کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی مہربانی سے پیش آئے اور ان دونوں کو ساتھ لے کر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی کے قریب باندرہ میں شاہ صاحب رہتے تھے۔ وہیں ان کو بھی رکھا اور کئی برس یہاں رہ کر ماہ عالم نے قرآن شریف اور مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھیں اور نماز روزے سے خوب واقف ہو گئے۔

ماہ عالم کہتے ہیں کہ جب میں خوب ہوشیار ہو گیا' تو ایک دن میں نے بغدادی شاہ صاحب سے مرید ہونے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا "میاں تم تو مریدوں کی مثل ہو۔" میں نے عرض کیا "نہیں جناب قاعدہ اور طریقہ کے موافق داخل سلسلہ فرما لیجئے۔" یہ سن کر شاہ صاحب آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور بولے۔ "مریدی بڑی مشکل چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو ہنسی کھیل سمجھ لیا ہے۔ رسمی طور سے مرید ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ مریدی کیا ہوتی ہے اور اس کے کیا آداب اور کیا فرائض ہیں۔ جتنی ٹھوکریں تم نے آج تک کھائی ہیں۔ اس سے ہزار درجہ زیادہ قدم قدم پر امتحان ہیں۔ بابا! یہ راستہ بڑا کٹھن ہے اور فقیری کے کوچہ میں ہزاروں ٹھوکریں ہیں۔

"آج کل کے لوگ دنیاوی خواہشوں کے پورا ہونے کے لئے مرید ہوتے ہیں' حالانکہ مریدی اس کا نام ہے کہ تمام خواہشیں اور تمنائیں مٹا کر پیر کا دامن پکڑے اور اگر از خود وہ خواہشیں نہ مٹ سکیں تو پیر سے یہی درخواست کی جائے کہ پہلے وہ انسانی جذبات کو فنا کرے۔

"میاں صاحب زادے! فقیری بھی ایک طرح کی بادشاہت ہے۔ جیسے بادشاہوں کو ملکی انتظام کے لئے لائق کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے' فقرا بھی اقلیم باطن کا نظم و نسق ذی ہوش لوگوں کے سپرد کرتے ہیں۔ بہادر شاہ کو انگریزوں کے مقابلے میں اسی لیے شکست ہوئی کہ ان کے پاس کام کر سکنے والے آدمی نہ تھے' ورنہ ایسی حالت میں کہ تمام ملک کی ہمدردی بادشاہ کے ساتھ تھی' مٹھی بھر انگریز کیا کر سکتے تھے' مگر انگریزوں کی لیاقت اور ملک داری کی قابلیت نے ان کو فتح دلائی اور بادشاہ ہار گئے۔ یہی حال درویشی فقیری کا ہے۔ انسان کے غنیم نفس و شیطان رات دن دولت ایمان لوٹنے کی درپے رہتے ہیں اور فقیر اپنے باطنی کمالات سے دشمنوں کو زک دے کر زیر کرتے ہیں' لیکن جب فقیروں میں کمالات مفقود ہو جائیں گے تو نفس شیطانی آسانی سے ایمان کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیں گے۔ اس زمانے میں چونکہ فقرا کی حالت اپنے طریقہ سے بالکل خلاف ہو گئی ہے' اس لئے مریدوں کی کیفیت بھی دگرگوں ہو گئی۔ تم کو چاہئے کہ پہلے اچھی طرح پیری مریدی کے فرائض اور کاموں کو سمجھ لو۔ اس کے بعد مرید ہونا۔"

☆ ☆ ☆

شہزادی کی بپتا

ہونے کو تو غدر پچاس برس کی کہانی ہے، مگر مجھ سے پوچھو تو کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اُن دنوں میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ میں اپنے بھائی یاور شاہ سے دو برس چھوٹی اور مرنے والی بہن ناز بانو سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان بانو ہے۔ ابا جان مرزا قویش بہادر ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ کے چہیتے اور نونہال فرزند تھے۔

بھائی یاور شاہ اور ہم بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ ہر ایک دوسرے پر فدا تھا۔ آ کا بھائی کے لیے باہر کئی استاد طرح طرح کی باتیں سکھانے والے تھے۔ کوئی حافظ تھا اور کوئی مولوی۔ کوئی خوش نویس تھا اور کوئی تیر انداز۔

اور ہم محل میں سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا مغلانیوں سے سیکھتے تھے۔ دستور تھا کہ حضرت ظل سبحانی جن بچوں اور بڑوں پر خاص نظر عنایت رکھتے تھے، ان کو صبح کا کھانا شاہی دسترخوان پر حضور والا کے ہمراہ کھلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ظل سبحانی مجھ کو بھی بہت چاہتے تھے اور میں ہمیشہ صبح کے وقت کھانے کے واسطے بلائی جاتی تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور چچا ابوبکر کے لڑکے مرزا اسہراب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے کل خاندان میں باہم پردہ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ شرعی نامحرم گھر میں آتے جاتے تھے، مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ میں ایک آن کے لیے کسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارا نہ کرتی تھی۔ پر کیا کرتی، حضور کے حکم کے خلاف دسترخوان پر کس طرح نہ جاتی، لیکن غنیمت یہ تھا کہ آداب سلطانی کے باعث سب نظریں جھکائے رکھتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ ایک بچہ بھی اِدھر اُدھر دیکھے یا آواز سے بولے۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب حضور معلی کوئی خاص کھانا کسی کو مرحمت فرماتے تو وہ بچہ ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے ادب پر جاتا اور جھک کر تین سلام بجا لاتا۔ ایک دن میرے ساتھ بھی یہی اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا ایرانی کھانا مجھ کو عطا کیا اور فرمایا "سلطانہ! تُو تو کچھ کھاتی ہی نہیں، ادب اور لحاظ ایک حد تک اچھا ہوتا ہے نہ کہ اتنا کہ دسترخوان پر سے بھوکا اٹھا جائے۔" میں کھڑی ہوئی اور جائے ادب پر جا کر تین آداب بجا لائی، مگر کچھ نہ پوچھو اس مشکل سے آئی گئی کہ دل ہی جانتا ہے۔ ہر قدم پر الجھتی تھی اور اوسان خطا ہوئے جاتے تھے۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا۔ وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے۔ جب ہم اپنے محلوں میں آزاد و بے فکر پھرا کرتے تھے۔ ظل سبحانی کا سایہ سر پر تھا اور لوگ ہمیں ملکۂ عالم کہہ کر پکارتے تھے۔ دنیا کے اتار چڑھاؤ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضور معلی مقبرہ ہمایوں میں گرفتار کیے گئے اور ایک گورے نے چچا جان حضرت مرزا ابوبکر بہادر کے طمنچہ مارا تو میرزا اسہراب تلوار گھسیٹ کر دوڑے، مگر دوسرے گورے نے ان کے گولی ماردی اور وہ ایک آہ کر کے چچا جان کی نعش پر گر پڑے اور تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے اور میں بت بنی تماشا دیکھتی رہی۔ اتنے میں خواجہ سرا آیا اور کہنے لگا "بیگم! کیوں کھڑی ہو چلو تمہارے ابا جان نے بلایا ہے۔" میں اسی بیخودی کے عالم میں اس کے ساتھ ہولی۔ دریائی دروازے سے اتر کر دیکھا کہ ابا جان میرزا قویش بہادر گھوڑے پر سوار ننگے سر کھڑے ہیں۔ تمام چہرے اور سر کے بال

خاک آلودہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آنسو بھر لائے اور فرمایا "لو سلطانہ! اب ہمارا بھی کوچ ہے۔ جوان بیٹا جس کے سہرے کی آرزو تھی' آنکھوں کے سامنے ایک سکھ کی سنگین کا نشانہ بن گیا۔" یہ سنتے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی یا ور کہہ کر رونے لگی۔ وہ گھوڑے سے اتر آئے۔ مجھ کو اور ناز بانو کو گلے لگا کر پیار کیا اور تسلی دینے لگے اور کہا "بیٹی! اب لوگ میری تلاش میں بھی ہیں۔ دو چار گھڑی کا مہمان ہوں۔ تم ماشاءاللہ جوان اور سمجھ دار ہو۔ اپنی چھوٹی بہن کو دلا سا دو اور آنے والی مصیبتوں پر صبر کرو۔ خبر نہیں اس کے بعد کیا پیش آنے والا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ تم کو تن تنہا چھوڑ کر کہیں جاؤں' پر ایک نہ ایک دن تمہیں بن باپ کا بننا ہی پڑے گا۔ ناز بانو تو ابھی بچہ ہے۔ اس کی دل داری کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا اور دیکھو ناز بانو! اب تم شہزادی نہیں ہو۔ کسی چیز کے لئے ضد نہ کرنا۔ جو میسر آئے شکر کر کے کھا لینا اور اگر کوئی شخص کچھ کھاتا ہو تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا ورنہ لوگ کہیں گے کہ شہزادیاں بڑی بدنیت ہوتی ہیں۔" پھر ہم دونوں کو خواجہ سرا کے سپرد کر کے کہا "ان کو جہاں ہمارے خاندان کے اور آدمی ہوں' پہنچا دینا۔" اس کے بعد ہم کو پیار کیا اور روتے ہوئے گھوڑا دوڑاتے جنگل میں گھس گئے۔ پھر پتہ نہ لگا کہ وہ کیا ہوئے۔

خواجہ سرا ہم کو لے چلا۔ یہ ہمارے گھر کا قدیمی نمک خوار تھا۔ تھوڑی دور تک ناز بانو جو نازوں کی پلی ہوئی تھی' چلی مگر پھر پاؤں کی طاقت نے جواب دے دیا اور قدم چلنا دوبھر ہو گیا۔ مجھ کو بھی کبھی پیدل چلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی تھی مگر بانو کو لیے ہوئے چلی جاتی تھی۔ اتنے میں ناز بانو کے ایک نوکدار کانٹا چبھ گیا اور وہ ہائے کہہ کر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اس کو اٹھایا اور کانٹا نکالنے لگی' مگر موا خواجہ سرا کھڑا دیکھا کیا اور یہ نہ ہوا کہ میرا ہاتھ بٹا لیتا بلکہ چلنے کی جلدی کرنے لگا۔ بہن بولی "آپا جان! مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا۔ ناظر کو بھیج کر گھر سے پالکی منگا لو۔" گھر اور پالکی کا نام سن کر میرا جی بھر آیا اور اس کو تسلی دینے لگی۔ خواجہ سرا نے پھر کہا کہ "چلو بس ہو چکا۔ جلدی چلو۔" ناز بانو کا مزاج تیز تھا۔ وہ نوکروں کو ہمیشہ سخت سست کہہ لیا کرتی تھی اور یہ لوگ دم بخود ہو کر سن لیتے تھے۔

اسی خیال سے اس نے خواجہ سرا کو پھر ایک دو باتیں سنا دیں۔ کم بخت کو سنتے ہی اتنا غصہ آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور بڑی بے ترسی سے بن باپ کی دکھیا بچی کے ایک طمانچہ مارا۔ بانو بلبلا گئی۔ وہ کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ پٹی تھی یا ایسا طمانچہ لگا۔

اس کے رونے سے مجھ کو بھی بے اختیار رونا آ گیا۔ ہم تو روتے رہے اور خواجہ سرا کہیں چلا گیا۔ پھر خبر نہ ملی کہ وہ کیا ہوا۔ ہم دونوں بمشکل تمام گرتے پڑتے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں پہنچے۔ یہاں دہلی کے اور خاص ہمارے خاندان کے سینکڑوں آدمی تھے' مگر ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار قیامت کا نمونہ تھا۔ کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ اسی اثناء میں وبا پھیلی اور پیاری بہن ناز بانو اس میں رخصت ہو گئیں۔ میں اکیلی رہ گئی۔ امن ہوا جب بھی مجھ دکھیا کو سکھ نہ ملا۔ آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریزی سرکار نے ہم لوگوں کی پرورش کرنی چاہی اور میرا پانچ روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر ہوا' جواب بھی ملتا ہے۔

☆ ☆ ☆

فاقہ میں روزہ (تاجدار دہلی کے ایک کنبہ کا فسانہ)

جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی' لال قلعہ پر تیموریوں کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابوظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے اور غدر سے پہلے ایک اتفاقی قصور کے سبب قید ہو کر الہ آباد چلے گئے تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ مرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر میں مغموم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا:

''خیر باشد۔ مزاج عالی مکدر پاتا ہوں'' مرزا نے مسکرا کر جواب دیا ''نہیں کچھ نہیں۔ بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت تمن خان گویا گا رہا تھا اور میرا دل بہلا رہا تھا۔ اس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں۔ ان کو یہ شور وغل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا' مگر اس پابندی سے جی الجھتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیونکر بسر ہوں گے۔''

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ''حضور یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے۔ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد تشریف لے چلا کیجئے۔ عجب بہار ہوتی ہے۔ رنگ برنگ کے آدمی طرح طرح کے جمگھٹے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہے۔ خدا والوں کی بہار بھی دیکھئے۔''

مرزا نے اس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں۔ کہیں قرآن شریف کے ورد ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سنانے والے حفاظ آپس میں ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں مسائل دین پر گفتگو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور بیسیوں آدمی گرد میں بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے۔ کہیں کوئی صاحب وظائف میں مشغول ہیں۔ الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔

کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ۔ مرزا کو یہ نظارہ نہایت پسند آیا اور وقت بہت لطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا۔ سینکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محل سلطانی سے متعدد خوان مکلّف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے تاکہ روزہ داروں میں افطاری تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب امراء علیحدہ افطاری کے سامان بھیجتے تھے' اس لیے ان خوانوں کی گنتی سینکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ چونکہ ہر امیر کوشش کرتا تھا کہ اس کا سامان افطاری دوسروں سے بڑھ کر رہے' اس لیے ریشمی رنگ برنگ کے خوان پوش اور ان پر مقیشی جھالریں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہوتی تھیں اور مسجد میں ان کی عجب آرائش ہو جاتی تھی۔

میرزا کے دل پر اس دینی چہل پہل اور شان و شوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔

گھر گھر میں وہ دیکھتے کہ سینکڑوں فقراء کو سحری اور اول شب کا کھانا روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوایا جاتا تھا اور باوجود رات دن کے لہو ولعب کے یہ دن ان کے گھر میں بڑی برکت اور چہل پہل کے معلوم ہوتے تھے۔

مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نو عمر کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا جو آج خواب وخیال کی طرح یاد آتا ہے اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیر وزبر ہو گئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا۔ امیروں کو پھانسیاں مل گئیں۔ ان کے گھر اکھڑ گئے۔ ان کی بیگمات ماما گیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان وشوکت تاراج ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولہے بنے ہوئے ہیں۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں۔ گھانس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہجہاں کی خوبصورت اور بے مثل مسجد اصطبل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجد واگزاشت ہو گئی اور سرکار نے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا ہوا۔ دیکھا چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ دو چار قرآن شریف کا دور کر رہے ہیں اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیئے۔ کسی نے ترکاری کے تلے تقسیم کر دیئے۔ نہ وہ اگلا سا ساں نہ وہ اگلی سی چہل پہل نہ وہ پہلی سی شان وشوکت۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد آج کل کا زمانہ بھی دیکھا جبکہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان تو مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غرباء آئے تو ان سے رونق کیا خاک ہو سکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد ہے۔ اگر مسلمانوں کے افلاس کا یہی عالم رہا تو آئندہ خبر نہیں کیا نوبت آئے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے غدر کا قصہ اور تباہی کا افسانہ سننا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور اس کے بیان کرنے میں عذر ومجبوری ظاہر کرنے لگے لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اس طرح سنائی۔

جب انگریزی توپوں نے کرچوں اور سنگینوں نے حکیمانہ توڑ جوڑ نے ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ تاج سر سے اتار لیا۔ تخت پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں آتش ناک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادر ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ چھوٹے سن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ حضور ظل سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا' قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ' کمسن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر اور اجڑے قافلے کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولان گاہ بنا ہوا ہے' اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق ودق جنگل' تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی؟ ایک بڑھاپے سے لاچار دو قدم چلنا دوبھر۔ دوسری بیمار اور حاملہ۔

تیسری دس برس کی نادان لڑکی۔ عورتیں روتی تھیں اور بیان کر کر کے روتی تھیں۔ میرا کلیجہ ان کے بیان سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں "الٰہی ہم کہاں جائیں۔ کس کا سہارا ڈھونڈیں۔ ہمارا تاج وتخت لٹ گیا' تو ٹوٹا بوریا اور امن کی جگہ تو دے۔ اس بیمار پیٹ والی کو کہاں لے کر بیٹھوں۔ اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں۔ جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں۔ کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔" بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منہ تکتی تھی۔ مجھ کو اس کی معصومانہ بے کسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب وہ یہ کہتیں:

"تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کر دیا جو بیکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھادی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنادی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبہ میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے۔ زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے۔ آج ہم پر آسمان روتا ہے۔"

تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ القصہ بہ ہزار دقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا۔ انہوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرادیا۔

کچھ روز تو ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرائے رکھا' لیکن کب تک یہ بار اٹھا سکتے تھے۔ اکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ "میاں جی! چوپاڑ میں ایک برات آنے والی ہے۔ تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن ٹھالی (بیکار) بیٹھے کیا کرے ہے۔ کچھ کام کیوں نہیں کرتا۔" میں نے کہا "بھائی! جہاں تم کہو گے وہیں جا پڑیں گے۔ ہمیں چوپاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں ہے۔ جب فلک نے عالی شان محل چھین لئے تو اس کچے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے۔ اور رہی کام کرنے کی بات سو میرا ہی تو خود گھبراتا ہے۔ خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتائی جاتی ہے۔ مجھ کو کوئی کام بتاؤ' ہو سکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔" ان کا چودھری بولا "ہم نے کے پیرا (ہمیں کیا خبر) کہ تم کے کام (کیا کام) کر سکے ہے۔" میں نے جواب دیا "میں سپاہی زادہ ہوں۔ تیغ تفنگ چلانا میرا ہنر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔" گنوار ہنس کر کہنے لگے "نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا۔ گھاس کھودنی پڑے گی۔ ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں۔" گنوار کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جواب دیا کہ "بھائیو! مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔" مجھ کو روتا دیکھ کر گنواروں کو رحم آ گیا اور بولے "اچھا تو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج دے دیا کریں گے جو تجھ کو برس دن کو کافی ہوگا۔"

چنانچہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینہ آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا۔ میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دبایا۔ وہ گاؤں وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر۔ خود لوٹ پوٹ کر اچھے ہو جاتے ہیں' مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی۔ سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ یہی حالت

میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہو گیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے' لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہو گئی۔ چونکہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا' اس لئے ہماری عورتوں کی چار پائیاں بالکل غرق آب ہو گئیں اور عورتیں چیخیں مارنے لگیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلّیوں میں دو چار پائیاں اڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اتر گیا مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔ پچھلی رات میری بیوی کے درد زہ شروع ہوا اور ساتھ ہی جاڑے سے بخار بھی لایا۔ اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ' مینہ کی جھڑی' کپڑے سب گیلے' آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے الٰہی کیا انتظام کیا جائے۔ درد بڑھنے شروع ہوئے اور مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ بچہ پیٹ ہی میں رہا۔

چونکہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں' غدر کی مصیبتیں ہی ان کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں۔ خیر اس وقت تو جان بچ گئی' مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا برا لگا کہ جان لے کر گیا۔

صبح ہو گئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گور غریباں میں ہمیشہ کے لیے جا سوئی۔

اب ہم کو کھانے کی فکر ہوئی کیونکہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا۔ گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اسی مصیبت میں گرفتار تھے۔

تاہم بیچارے گاؤں کے چودھری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک روپے کا آٹا منگوا دیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا۔ والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک تھا۔ وہ ہر وقت گذشتہ زمانے کو یاد کیا کرتی تھیں۔ رمضان کا چاند دیکھ کر انہوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو پچھلا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ تسلی کی باتیں کرنے لگا جس سے ان کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گذر گئے۔ مگر جب آٹا ختم ہو چکا تو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا۔ بھوک کے مارے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اس قسم کی تکلیف کے وقت بیان کر کے بہت رویا کرتی تھیں' مگر آج بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ ان کی خاموشی و اطمینان سے میرے دل کو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اڑ رہی تھیں' دلاسا دینے لگا۔ وہ معصوم بھی میرے سمجھانے سے نڈھال ہو کر چار پائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے' بس ایک غوطہ سا تھا۔

اس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آ گیا۔ والدہ صاحبہ اٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد جن دردناک الفاظ میں انہوں نے دعا مانگی ان کا نقل کرنا محال ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ:

"ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا یل رہی ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے گھر سے سینکڑوں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزہ پر روزہ رکھ رہے ہیں۔ خداوندا! اگر ہم سے قصور ہوا ہے تو اس

معصوم بچی نے کیا خطا کی جس کے منہ میں کل سے ایک کھیل اڑ کر نہیں گئی۔"

دوسرا دن بھی یونہی گذر گیا اور فاقہ میں روزہ در روزہ رکھا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا" آج ہمارے ہاں نیاز تھی۔ یہ اس کا کھانا ہے اور یہ پانچ روپیہ زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں' مگر اب کے نقد دے دیا ہے۔"

یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئے گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکرانہ بھیجتا جاتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردش فلک نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈال دیا' لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیمی غیرت داری پر قائم ہے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے انہوں نے تیور بدل کر کہا" تف ہے تیری غیرت پر۔ خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مر جانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مر جانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے۔ صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں ہے۔"

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینہ آ گیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ چاہا کہ اٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں' مگر والدہ نے روکا اور کہا" خدا ہی کو یہ منظور ہے تو ہم کیا کریں۔ سب کچھ سہنا ہو گا۔" یہ کہہ کر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے مل کر کھا لیا۔ پانچ روپیہ کا آٹا منگوایا گیا۔ جس سے رمضان خیر و خوبی سے بسر ہو گیا۔

اس کے بعد چھ مہینے گاؤں میں رہے۔ پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آ کر والدہ کا انتقال ہو گیا اور بہن کی شادی کر دی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔

☆　☆　☆

غدر کی تصویر

اللہ اللہ زمانہ کے نشیب و فراز میں کتنے پُرحسرت نظارے ہیں۔ یہی دہلی جو اپنی گود میں ہزاروں ارمان بھرے دلوں کا خون بہتا دیکھ چکی ہے۔ رہ رہ کے پلٹے کھاتی اور رنگ دکھاتی ہے۔ ایک دن وہ تھا کہ بابر کی تلوار نے ابراہیم لودھی کا خون دہلی کے ریگستان کو پلایا اور اس کے اہل و عیال کو حسرت و یاس کی مجسم تصویر بنا ہوا سامنے دست بستہ کھڑا دیکھا یا ایک دن ایسا آیا کہ اسی کی اولاد اپنے اعمال کی بدولت ان بیکسوں کا نمونہ بنی۔

آہ! دہلی دربار کی نمائش گاہ میں داخل ہوتے ہی ایک تصویر پر نظر پڑی' جس میں بزم تیموری کی گل ہونے والی شمع ابوظفر بہادر شاہ مقبرہ ہمایوں میں میجر ہاڈسن کے ہاتھوں گرفتار کئے جا رہے ہیں۔ پشت پر ہمایوں کا مقبرہ نظر آتا ہے' جس پر کچھ عجیب دلگیر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ بہادر شاہ عبا پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں عصا ہے۔ چہرہ پر غم و الم میں ڈوبا ہوا بڑھاپے کا رنگ اور تمتمانہ یاس کا عالم ہے۔ میجر ہاڈسن سرخ وردی پہنے بادشاہ کا دامن پکڑ کر کھڑے ہیں اور ان کے

دوہمراہی بادشاہ کی پشت پر نظر آتے ہیں۔ میجر ہارسن کی اس بیباکانہ جرأت پر بہادر شاہ کا ایک بوڑھا جان نثار تلوار سونت کر لپکتا ہے۔ ہاتھ میں ڈھال ہے' مگر بشرہ نڈھال۔ قریب پہنچتے پہنچتے برابر والا سولجر پستول سامنے کر کے اس کا بڑھا ہوا حوصلہ پست اور جوش انتقام سرد کر دیتا ہے۔

افسوس ہے کہ دنیا کے اس مصیبت خیز انجام پر بھی لوگوں کو اس کی ہوس باقی ہے۔
چلتے وقت ''دیوانِ حافظ'' کا دم بخود کھلا ہوا ایک ورق نظر پڑا۔ جس کی پہلی سطر تھی

آخر نظر بسوئے ما کن
اے دولت خاص و حسرت عام

یہ پڑھتا ہوا باہر آیا اور اس مرقع کو مخاطب کر کے اس شعر کو دہرایا۔

☆ ☆ ☆

بھکاری شہزادہ

میں قریشیہ بیگم کا لاڈلا بیٹا ہوں' جو بہادر شاہ بادشاہ کی مشہور صاحبزادی تھیں۔ بچپن میں میں صاحب عالم میرزا قمر سلطان بہادر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا' مگر اب ذلیل گداگر کے سوا کوئی نام نہیں۔ پہلے بھی خوش تھا' اب بھی راضی ہوں۔ گردش و انقلاب کا کیا شکوہ؟

سلطانی محلوں میں پیدا ہوا۔ آنکھ کھولی تو سامنے ایک خدائی کو ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا دیکھا۔ ہوش سنبھالا' تو عالم ہی اور نظر آیا۔ بڑے بڑے خودسر امیر الامراء آنکھ کے اشارے پر دوڑتے تھے۔ خیال تھا کہ ہم صرف اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ سر اور آنکھوں پر بٹھائے جائیں۔ یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں کوئی دوسری زندگی بھی ہوتی ہے' مگر قدرت کے قربان جایئے۔ اس نے اپنی نیرنگی کے صد ہا تماشے دکھائے۔ عروج بھی دیکھا اور زوال بھی۔ نسل شاہ ہونے کا وہ لطف بھی اٹھایا اور یہ مزا بھی چکھا۔ اپنی اپنی آن میں دونوں نرالے ہیں۔ حالت تو اس قابل نہ تھی مگر رحم دل انگریزوں نے رحم کھا کر پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

اب کیا تھا چار دن کے لیے پھر وہی شہزادہ عالم پناہ بن گئے۔ تنخواہ پر اس قدر قرضہ بڑھا کہ قرضخواہ کی ملک بن گئی۔ اب ہمارے لیے سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں' لیکن شرم دامن گیر تھی۔ اسی اثناء میں آنکھوں کا نور جاتا رہا اور خاصے اندھے محتاج بن گئے۔ حیران تھا کہ الٰہی اب کیا کروں۔ مجبور ہو کر کاسہ گدائی ہاتھ میں لیا اور گداگری کی ٹھہرا دی۔ رات کی تاریکی میں نکلتا ہوں اور صدائے عام لگا کر بھیک مانگتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں۔ مرزا تم دن کو کیوں نہیں نکلتے' تو کہہ دیتا ہوں۔ بھائی غیرت کے سبب۔ جس شہر کی سڑکوں پر میری سواری کی سلامتی ہوتی تھی وہاں دل نہیں چاہتا کہ دن کی روشنی میں دست طلب پھیلاؤں۔ بس یہی میری سرگذشت ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا دکھڑا بیان کروں۔

آہ صاحبو! یہ فرضی فسانہ نہیں۔ عبرت کی سچی کہانی ہے۔ مرزا قمر سلطان قریشیہ بیگم کے صاحبزادے ہررات کو دہلی کے بازاروں میں صدا لگاتے نظر آتے ہیں مگر ہائے بھیک بھی ایک شان سے مانگتے ہیں۔ نہ کہیں ٹھہرتے ہیں۔ نہ کسی کو مخاطب بناتے ہیں۔ بس ایک آواز ہوتی ہے

''یا اللہ ایک پیسہ کا آٹا دلوادے۔''

جو مختلف بازاروں میں چکر لگا کر اپنے مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔ (کئی برس ہوئے یہ شہزادے صاحب انتقال فرما گئے)۔

☆　☆　☆

شاہی نسل کا ایک کنبہ

حضرت محبوب الٰہیؒ غریب نواز کا دستور تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی عمدہ کھانا آتا تھا تو آبدیدہ ہو کر فرماتے ''میں شکم سیر ہو کے کھانا کھاؤں اور میرے سینکڑوں بھائی گھروں میں بھوکے پڑے ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ پہلے ان میں سے دو چار کی خبر لو۔ اس کے بعد میرے پاس لاؤ۔''

اسی طرح جب کوئی کپڑا آتا۔ تو رو کر ارشاد فرماتے ''آہ! نظام یہ کپڑا پہنے اور اس کے بھائی مسجدوں کے دروازوں پر اور تنوروں کے سامنے سکڑے پڑے ہوں۔ پہلے ان کو دو۔ یہ سب سے اچھا کام ہے۔''

پس جو لوگ حضرت محبوب الٰہیؒ کی غلامی اور پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں ان پر فرض ہے کہ غربا اور محتاج انسانوں کی خبر گیری کیا کریں۔

ایک دفعہ دہلی میں سردی کا یہ عالم تھا کہ گھروں میں برتنوں کا پانی تک جم جاتا تھا۔ اس کیفیت کے دیکھنے سے ایک دن مجھے خیال آیا کہ اپنے غریب بھائیوں کی حالت معلوم کرنی چاہئے کہ آج کل ان پر کیا گذر رہی ہے اس لئے دہلی گیا اور اپنے ایک غریب دوست کے مکان پر قیام کیا' جس کے چاروں طرف مفلوک الحال شہزادے آباد ہیں۔ اس گھر کی دیوار کے متصل ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا اور اس میں ایک شاہی نسل کا کنبہ رہتا تھا۔

میں نے سنا کہ یہ شہزادے صاحب صدر بازار میں کسی مسلمان سوداگر کی خدمتگاری پر نوکر تھے' مگر آج کل بیکار ہیں' کیونکہ وہ سوداگر کلکتہ چلا گیا ہے اور بڑھاپے کے سبب ان کا ملازم رکھنا پسند نہیں کرتا۔ بے چارے کے تین چھوٹے چھوٹے لڑکے اور ایک اٹھارہ برس کی لڑکی ہے۔ لڑکی کا بیاہ ہو گیا ہے مگر خاوند کے برے اطوار ہونے کے سبب ماں باپ کے گھٹنے سے لگی جوانی کے دن کاٹ رہی ہے۔ مجھ کو ایک ایسی جگہ بٹھا دیا گیا جہاں دیوار میں ایک بڑا سوراخ تھا اور غریب شہزادہ کا گھر صاف نظر آتا تھا۔

چھوٹا سا دالان اور ایک کوٹھڑی اور سامنے کھلی ہوئی صاف انگنائی۔ دالان میں گھر اور سلیقہ شعار شہزادی نے کھجور کے بوریوں کا فرش بچھا رکھا تھا۔ کوٹھڑی کے اندر کچھ رکھا ہو تو معلوم نہیں۔ سامنے دالان میں تو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ہاں کونے میں صد ہا پیوند لگی ہوئی گدڑی رکھی تھی اور اس سے ذرا ادھر کو ایک پرانا پھٹا ہوا کمبل اوڑھے ہوئے تین بچے بیٹھے

تھے۔ شہزادی خود باجرے کی روٹی پکا رہی تھیں اور لڑکی سل پر چٹنی پیس رہی تھی۔

اتنے میں ایک بچہ بولا "لاؤ باجی جان چٹنی لاؤ۔ دیکھو روٹی ٹھنڈی ہوئی جاتی ہے۔" یہ سن کر لڑکی نے جلدی جلدی چٹنی سمیٹی اور بچوں کے آگے ایک پیالی میں رکھ دی۔ بچے باجرے کی روٹی کھانے لگے۔ اسی اثنا میں شہزادہ صاحب آ گئے۔ ایک میلی سی دُلائی اوڑھے ہوئے تھے۔ دالان میں دیوار سے لگ کر چپ بیٹھ گئے۔

لڑکی بولی "کیوں ابا جان خیر ہے۔ آپ اداس کیوں بیٹھے ہیں۔" یہ سن کر شہزادے صاحب نے گردن اٹھائی۔ اور جواب دیا "کچھ نہیں خیر سلا ہے۔ آج تمام دن لوگوں کی سلامی اور خوشامد میں گذر گیا' مگر کہیں بھروسہ کی نوکری نہ ہوئی۔ جہاں دو روٹی کا سہارا ہوتا۔ ناچار ہو کر گھر کو واپس آ رہا تھا۔ سامنے سے لایق داماد صاحب کو پولیس کی حراست میں ہتھ کڑیاں پہنے جاتا دیکھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کسی بازاری عورت کی ناک کاٹ لی تھی۔ یہ سن کر اور دیکھ کر اور بھی صدمہ ہوا۔ جب محلہ میں آیا تو بنئے نے جس سے قرض سودا آتا ہے۔ تقاضا کیا اور ایسا سخت کہ دل کو بہت برا معلوم ہوا۔ اب اس فکر میں بیٹھا ہوں کہ کیا کروں۔ سردی نے الگ ستا رکھا ہے۔ نوکری کی یہ صورت ہے اور سب سے بڑھ کر تیرا جلاپا ہے۔ مجھے تو خداوند دنیا سے اٹھالے۔ تاکہ ان سختیوں سے نجات پاؤں۔"

اتنا کہہ کر شہزادہ صاحب نے گردن جھکا لی۔ میں نے دیکھا کہ بدنصیب لڑکی پر اس کا برا اثر پڑا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں اور آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس وقت اس اجڑے گھرانے کا منظر بڑا دردناک تھا اور نوجوان لڑکی کی بے کسی نے دنیاوی آرام و مصائب کی تصویر کھینچ دی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سونے کا سامان کیا گیا۔ تینوں لڑکے اور ایک لڑکی برابر لیٹ گئے اور شہزادی نے اوپر سے وہی گدڑی جو کونے میں رکھی تھی' آڑی اڑھادی۔ بچے تو چھوٹے قد ہونے کے سبب اس چوڑان میں ڈھک گئے' مگر لڑکی کے پیر پنڈلیوں تک کھلے رہے' اس لئے اس غریب نے پیروں کو سمیٹ لیا اور گٹھڑی بن کر پڑ گئی۔

شہزادہ صاحب اسی پتلی سی دُلائی میں سکڑ کر دراز ہو گئے' جو دن کو اوڑھے پھرتے تھے اور شہزادی صاحب نے وہ پرانا کمبل اوڑھا جس کو بچوں کے پاس دیکھا تھا۔ اس شان سے یہ شاہی نسل کا کنبہ خواب راحت میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت میرے دل پر زمانہ کے تغیرات کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ امید نہیں کہ کسی خوشحال آدمی کو اس کے قصور اور خیالات نے ایسا پُر عبرت اور پُر حسرت تماشا دکھایا ہو۔ اگر وہ لوگ غربت کی زندگی کا نظارہ کریں تو اپنی فانی امارت پر کبھی غرور نہ آئے۔

اس وقت خود بخود اس گروہ کا دھیان آ گیا جو بے پردگی کا حامی ہے' مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس سوسائٹی کی یہ حالت ہو' نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ کو روٹی' اس کی عورتیں باہر کی دنیا کا کیا لطف اٹھا سکتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

بہادر شاہ کا دعا نامہ پرنس کے نام
(بزمانہ سیاحت پرنس آف ویلز ۱۹۰۶ء جو آج کل شہنشاہ جارج ہیں' لکھا گیا)

اقبال مند تاجدار بھائی کا فرزند رنگون میں آتا ہے۔ آرزو تھی کہ اس کی شان اور اپنی آن کے موافق میزبانی کرتا' مگر بے سرو سامانی سے مجبور ہوں۔ لاچار ہوں۔ قبر کی چھوٹی سی کوٹھڑی گیلی اور سیلی خاک کا بچھونا' اس پر ایک پھٹے پرانے کفن میں ہڈیوں کی پوٹ' باہر دیکھو تو ٹینس کھیلنے کا میدان۔ احاطہ بھی کچھ زیادہ بارونق اور دلچسپ نہیں۔ بھلا ایسے منحوس ویرانے میں اپنے گورے چٹے برادرزادہ کو کیونکر مدعو کروں۔ پس میری طرف سے تو یہ مختصر سا دعا نامہ بھیج دینا کافی ہوگا:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

جان ظفر!

خدا تمہارے دم سے میرے بھائی ایڈورڈ کے گھر کا چراغ روشن رکھے۔ اپنی جوانی کا سکھ دیکھو۔ شاد رہو۔ آباد رہو' لیکن بیٹا سنا ہے کہ آج کل کی کوئی تحریر مطلب اور غرض سے خالی نہیں ہوتی۔ اس لئے تمہارا دعا گو ناتوان بھی اپنی بپتا کے دو چار لفظ کہنا چاہتا ہے۔ تمہاری سعادت مندی سے امید ہے کہ ان کو توجہ سے سنو گے اور اپنے پدر بزرگوار سے من وعن کہہ دو گے۔

اول تو یہ کہنا کہ تمہارا نا شاد و نامراد بھائی پردیس میں پڑا ہے۔ شامت اعمال کے سبب نام تو مٹا ہی تھا۔ اب قبر بھی مٹا دی گئی (اب قبر کا نشان بن گیا ہے۔۔ حسن نظامی)

شان شہنشاہی سے بعید ہے کہ ایک عزت دار کی بے عزتی اور پامالی روا رکھی جائے۔

اس کے بعد یہ پیام دینا کہ آل ظفر آج کل سخت مصیبت میں ہے۔ کوڑی کوڑی سے محتاج۔ گداگری و جاروب کشی سے بھی پیٹ نہیں پلتا۔ جہاں اکثر کی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے' باقی نامرادوں کو بھی نواز دو۔

میری روح کو سخت اذیت ہوتی ہے' جب بال بچوں کو بھوکا پیاسا دیکھتا ہوں۔ فاتح بھائی سے مفتوح بھائی کو مانگنے میں عار نہیں۔ تم سے نہ کہوں تو کیا ہندوستان کی رعایا سے کہوں جس کو میرے بچوں پر ترس نہیں آتا۔

اللہ کی شان! وہ راجہ' نواب اور دولت مند لوگ جو ہمارے دروازے پر سر جھکانا فخر جانتے تھے' آج ہماری نسل کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔

یہ کڑا کے کی سردی۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی شال دوشالوں میں سوئیں اور میری اولاد کو پھٹا کمبل بھی نصیب نہ ہو۔ لوگ دیکھتے ہیں سمجھتے ہیں مگر ذرا رحم نہیں کرتے۔ خیر اس میں کسی کا قصور نہیں۔ شکوہ بھی فضول ہے۔ یہ تو اپنی قسمت کا لکھا سامنے آ رہا ہے۔ تاہم مجھے گوارا نہیں کہ ہندوستان کے کسی آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔ تم کو لکھتا ہوں تا کہ میرے منصف مزاج ہمسر کو میرے حال زار کی خبر کر دو۔

☆ ☆ ☆

بنتِ بہادر شاہ

یہ ایک بے چاری درویشنی کی سچی کہانی ہے' جو زمانہ کی گردش سے ان پر گذری۔ ان کا نام کلثوم زمانی بیگم تھا۔ یہ دہلی کے آخری مغل بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کی لاڈلی بیٹی تھیں۔ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے بار ہا شہزادی صاحبہ سے خود ان کی زبانی ان کے حالات سنے ہیں کیونکہ ان کو ہمارے حضور خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ سے خاص عقیدت تھی' اس لیے اکثر حاضر ہوتی تھیں اور مجھ کو ان کی دردناک باتیں سننے کا موقع ملتا تھا۔ نیچے جس قدر واقعات لکھے گئے ہیں وہ یا تو خود ان کے بیان کردہ ہیں یا ان کی صاحبزادی زینب زمانی بیگم کے جواب تک زندہ ہیں اور پنڈت کے کوچہ میں رہتی ہیں اور وہ حالات یہ ہیں:

جس رات میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لٹنے کا وقت قریب آیا' تو دلّی کے لال قلعہ میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ درودیوار پر حسرت برستی تھی۔ اجلے اجلے سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین وقت سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا۔ زینب میری گود میں ڈیڑھ برس کا بچہ تھی اور دودھ کے لئے بلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ کسی انا کے۔ ہم سب اس یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظلِ سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔ آدھی رات کا وقت' سناٹے کا عالم' گولوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے' لیکن حکم سلطانی ملتے ہی حاضری کے لیے روانہ ہو گئے۔ حضور مصلے پر تشریف رکھتے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی۔ جب میں سامنے پہنچی۔ جھک کر تین مجرے بجالائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے "کلثوم! لو اب تم کو خدا کو سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے۔ تم اپنے خاوند کو لے کر فوراً کہیں چلی جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں' پر کیا کروں' ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے۔ الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے۔"

اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لئے بلند کئے' جو رعشہ کے سبب کانپ رہے تھے۔ دیر تک آواز سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے رہے "خداوندا! یہ بے وارث بچے تیرے حوالے کرتا ہوں۔ یہ محلوں کے رہنے والے جنگل ویرانوں میں جاتے ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں۔ تیمور کے نام کی عزت رکھیو اور ان بے کس عورتوں کی آبرو بچائیو۔ پروردگار یہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے ہندو مسلمان میری اولاد ہیں اور آج کل سب پر مصیبت چھائی ہے۔ میرے اعمال کی شامت سے ان کو رسوا نہ کر اور سب پریشانیوں سے نجات دے۔"

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ زینب کو پیار کیا اور میرے خاوند میرزا ضیاء الدین کو کچھ جواہرات عنایت کر کے نور محل صاحبہ کو بھی ہمراہ کر دیا' جو حضور کی بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعہ سے نکلا' جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند میرزا ضیاء الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ عورتوں میں ایک میں' دوسری نواب نور محل' تیسری حافظ

سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے، صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے سب چھپ گئے تھے، مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہم نے اپنے بھرے پُرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو امنڈ نے لگے۔ نواب نورمحل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں۔ گویا صبح کے ستارے کا جھلملانا نورمحل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر لال قلعہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کورالی گاؤں میں پہنچے اور وہاں اپنے رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ باجرے کی روٹی اور چھاچھ کھانے کو میسر آئی۔ اس وقت بھوک میں یہ چیزیں بریانی متنجن سے زیادہ مزیدار معلوم ہوئیں۔ ایک دن رات تو امن سے بسر ہوا، مگر دوسرے دن گردونواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر کورالی کو لوٹنے چڑھ آئے۔ سینکڑوں عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں، جو چڑیلوں کی طرح ہم لوگوں کو چمٹ گئیں۔ تمام زیور اور کپڑے ان لوگوں نے اتار لئے۔ جس وقت یہ سڑی بُسی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں تو ان کے لہنگوں سے ایسی بُو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی روٹی کو کافی ہو سکتا۔ حیران تھے کہ دیکھئے اب کیا پیش آئے گا۔ زینب پیاس کے مارے رو رہی تھی۔ سامنے سے ایک زمیندار نکلا۔ میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی۔ بھائی تھوڑا پانی اس بچی کو لا دے۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا ''آج تُو میری بہن اور میں تیرا بھائی۔'' یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کا نام بستی تھا۔ اس نے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہم کو سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں۔ ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی شاہی حکیم رہتے ہیں جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں۔ وہاں لے چل۔ بستی ہم کو اجاڑہ لے گیا، مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا جس کی کوئی حد نہیں۔ صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کہ میں تم لوگوں کو ٹھہرا کر اپنا گھر بار تباہ کرنا نہیں چاہتا۔

وہ وقت بڑی مایوسی کا تھا۔ زمین آسمان میں کہیں ٹھکانا نظر نہ آتا تھا۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہوگی۔ اس پر بے سروسامانی کا یہ عالم۔ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً پورا کیا جائے، وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اس نے زبانی بہن کہنے کو آخر تک نباہا اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ لاچار اجاڑہ سے روانہ ہوئے۔ حیدرآباد کا رخ کیا۔ عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے۔ تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے، جہاں کوئل کے نواب کی فوج پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اتارا۔ ابھی ہم ندی کے پار اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں، مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جایئے۔ ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے۔ سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی۔ ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے۔ ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی آئی۔ جو کچھ بھی ہو۔ ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا۔ ہم لوگ وہاں سے نکل کر بھاگے۔ پر ہائے کیسی مصیبت

تھی۔ ہم کو بھاگنا بھی نہ آتا تھا۔ گھاس میں الجھ الجھ کر گرتے تھے۔ سر کی چادریں وہیں رہ گئیں۔ برہنہ سر۔ حواس باختہ ہزار وقت سے کھیت کے باہر آئے۔ میرے اور نور محل کے پاؤں خونم خون ہو گئے۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں۔ زینب پر غشی کا عالم تھا۔ مرد ہم کو سنبھالتے تھے مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ میں زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں۔ کہیں سہارا نظر نہیں آتا۔ قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہو گئی لیکن فقیروں کو چین اور اطمینان ہوتا ہے۔ یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ بستی ندی سے پانی لایا۔ ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرہ پر چھڑکا۔ نور محل رونے لگیں اور بولیں۔ "ابھی خواب میں تمہارے بابا جان حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے کہ طوق و زنجیر پہنے ہوئے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج ہم غریبوں کے لئے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرش مخمل سے بڑھ کر ہے۔ نور محل گھبرانا نہیں۔ ہمت سے کام لینا۔ تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں۔ ذرا میری کلثوم کو دکھا دو۔ میں جیل خانہ جانے سے پہلے اس کو دیکھوں گا۔"

بادشاہ کی یہ باتیں سن کر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھل گئی۔ کلثوم کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوگا۔ کیا واقعی وہ قیدیوں کی طرح جیل خانے بھیجے گئے ہوں گے۔ مرزا عمر سلطان نے اس کا جواب دیا کہ یہ خواب و خیال ہے۔ بادشاہ لوگ بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدسلوکیاں نہیں کیا کرتے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ وہ اچھے حال میں ہوں گے۔ حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن بولیں۔ یہ موئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے۔ خود اپنے بادشاہ کا سر کاٹ کر سولہ آنے کو بیچتے ہیں۔ بوا نور محل تم نے تو طوق اور زنجیر پہنے دیکھا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ نیموں سے تو اس سے زیادہ بدسلوکی دور نہیں ہے مگر میرے شوہر میرزا ضیاء الدین نے تسکین و دلاسے کی باتیں کر کے سب کو مطمئن کر دیا۔ اتنے میں بستی ناؤ میں گاڑی کو اس پار لے آیا اور ہم سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر شام ہو گئی اور ہماری گاڑی ایک گاؤں میں جا کر ٹھہری جس میں مسلمان راجپوتوں کی آبادی تھی۔ گاؤں کے نمبردار نے ایک چھپر ہمارے واسطے خالی کرا دیا جس میں سوکھی گھاس اور پھوس کا بچھونا تھا۔ وہ لوگ اسی گھاس پر جس کو پیال یا پرال کہتے ہیں سوتے ہیں۔ ہم کو بھی بڑی خاطر داری سے (جوان کے خیال میں بڑی خاطر تھی) یہ نرم بچھونا دیا گیا۔ میرا تو اس کوڑے سے جی الجھنے لگا پر کیا کرتے۔ اس وقت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ ناچار اسی میں پڑ رہے۔ دن بھر کی تکلیف اور تکان کے بعد اطمینان اور بے فکری میسر آئی تھی۔ نیند آ گئی۔ آدھی رات کو ایکا ایکی ہم سب کی آنکھ کھل گئی۔ گھاس کے تنکے سوئیوں کی طرح بدن میں چبھ رہے تھے اور پسو جگہ جگہ کاٹ رہے تھے۔ اس وقت کی بے کلی بھی خدا کی پناہ۔ پسوؤں نے تمام بدن میں آگ لگا دی تھی۔ مخملی تکیوں ریشمی نرم نرم بچھونوں کی عادت تھی اس لئے تکلیف ہوئی ورنہ ہم ہی جیسے وہ گاؤں کے نرم آدمی تھے جو بے غل و غش اسی گھاس پر پڑے سوتے تھے۔ اندھیری رات میں چاروں طرف گیدڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور میرا دل سہما جاتا تھا۔ قسمت کو پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن شہنشاہ ہند کے بال بچے یوں خاک پر بسیرے لیتے پھریں گے۔ قصہ مختصر اسی طرح منزل بمنزل تقدیر کی گردشوں کا تماشہ دیکھتے ہوئے حیدر آباد پہنچے اور سیتارام پیٹھ میں ایک مکان کرایہ کو لے کر ٹھہرے۔

جبل پور میں میرے شوہر نے ایک جڑاؤ انگوٹھی جو لوٹ کھسوٹ سے بچ گئی تھی فروخت کی۔ اسی میں راستہ کا خرچ چلا اور چند روز یہاں بھی بسر ہوئے۔ آخر تا بہ کے۔ جو کچھ تھا ختم ہو گیا۔ اب فکر ہوئی کہ پیٹ بھرنے کا کیا حیلہ کیا جائے۔ میرے شوہر اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے۔ انہوں نے درود شریف خط حیران میں لکھا اور چار سنار پر ہدیہ کرنے لے گئے۔ لوگ اس خط کو دیکھتے تھے اور حیرت میں رہتے تھے۔ اول روز پانچ روپیہ کو درود شریف ہدیہ ہوا۔ اس کے بعد یہ قاعدہ ہوا کہ جو کچھ لکھتے، کتی بڑھتی فوراً بک جاتا۔ اس طرح ہماری گذر اوقات بہت عمدگی سے ہونے لگی، لیکن موئی ندی کے چڑھاؤ سے ڈر کر شہر میں داروغہ احمد کے مکان میں اٹھ آئے۔ یہ شخص حضور نظام کا خاص ملازم تھا۔ اس کے بہت سے مکان کرایہ پر چلتے تھے۔

چند روز بعد خبر اڑی کہ نواب لشکر جنگ جس نے شہزادوں کو اپنے پاس پناہ دی تھی، انگریزوں کے عتاب میں آ گیا ہے اور اب کوئی شخص دہلی کے شہزادوں کو پناہ نہیں دے گا، بلکہ جس کو کسی شہزادہ کی خبر ملے گی اس کو گرفتار کرانے کی کوشش کرے گا۔ ہم سب اس خبر سے گھبرا گئے اور میں نے شوہر کو باہر نکلنے سے روک دیا کہ کہیں کوئی دشمن پکڑوا نہ دے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے فاقوں کی نوبت آ گئی تو ناچار ایک نواب کے لڑکے کو قرآن پڑھانے کی نوکری میرے شوہر نے بارہ روپیہ ماہوار پر کرلی۔ چپ چاپ اس کے گھر چلے جاتے اور پڑھا کر آ جاتے، مگر وہ نواب اس قدر بدمزاج تھا کہ ہمیشہ معمولی نوکروں کی طرح میرے شوہر کے ساتھ برتاؤ کرتا تھا، جس کی برداشت وہ نہ کر سکتے تھے اور گھر میں آ کر رو رو کر دعا مانگتے کہ الٰہی اس ذلت کی نوکری سے تو موت لاکھ درجہ بڑھ کر ہے۔ تو نے اتنا محتاج بنا دیا کہ کل تو اس نواب جیسے سینکڑوں ہمارے غلام تھے اور آج ہم اس کے غلام ہیں۔ اسی اثناء میں کسی نے میاں نظام الدین صاحب سے ہماری خبر کر دی۔ میاں کی حیدرآباد میں بڑی عزت تھی، کیوں کہ میاں حضرت کالے میاں صاحب چشتی نظامی فخری کے صاحبزادے تھے جن کو بادشاہ دہلی اور نظام اپنا پیر تصور کرتے تھے۔ میاں رات کے وقت میانہ میں سوار ہو کر ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم کو دیکھ کر بہت روئے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ قلعہ میں تشریف لاتے تھے تو مسند زرنگار پر بٹھائے جاتے تھے۔ بادشاہ بیگم اپنے ہاتھ سے لونڈیوں کی طرح مگس رانی کرتی تھیں۔ آج وہ گھر میں آئے تو ثابوت بوریہ بھی نہ تھا جس پر وہ آرام سے بیٹھ جاتے۔ پچھلا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ خدا کی شان کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میاں بہت دیر تک حالات دریافت فرماتے رہے۔ اس کے بعد تشریف لے گئے۔ صبح پیام آیا کہ ہم نے خرچ کا انتظام کروا دیا ہے۔ اب تم حج کا ارادہ کرلو۔ یہ سن کر جی باغ باغ ہو گیا اور مکہ معظمہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ القصہ حیدرآباد سے روانہ ہو کر بمبئی آئے اور یہاں اپنے بچے رفیق بستی کو خرچ دے کر اس کے گھر رخصت کر دیا۔ جہاز میں سوار ہوئے۔ جو مسافر یہ سنتا تھا کہ ہم شاہ ہند کے گھرانے کے ہیں تو ہمارے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتا تھا۔ اس وقت ہم سب درویشانہ رنگین لباس میں تھے۔ ایک ہندو نے جس کی شاید عدن میں دکان تھی اور جو ہمارے حال سے بے خبر تھا، پوچھا کہ تم لوگ کس پنتھ کے فقیر ہو۔ اس کے اس سوال نے زخمی دل کو چھیڑ دیا۔ میں بولی ہم مظلوم شاہ گرو کے چیلے ہیں۔ وہی ہمارا باپ تھا اور وہی ہمارا گرو۔ پاپی لوگوں نے اس کا گھر بار چھین لیا اور ہم کو اس سے جدا کر کے جنگلوں میں نکال دیا۔ اب وہ ہماری صورت کو ترستا ہے اور ہم اس کے درشنوں بغیر بے چین ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا اپنی فقیری کی حقیقت بیان کریں۔ جب اس نے ہماری اصلی کیفیت لوگوں سے سنی تو بیچارا رونے لگا اور بولا بہادر شاہ ہم سب کا باپ اور گرو تھا۔ کیا کریں رام جی کی یہی مرضی تھی کہ وہ بے گناہ برباد ہو گیا۔

مکہ پہنچے تو اللہ میاں نے ٹھہرنے کا ایک عجیب ٹھکانا پیدا کر دیا۔ عبدالقادر نامی میرا ایک غلام تھا جس کو میں نے آزاد کر کے مکہ بھیج دیا تھا۔ یہاں آ کر اس نے بڑی دولت کمائی اور زمزم کا داروغہ ہو گیا۔ اس کو جو ہمارے آنے کی خبر ملی' دوڑا ہوا آیا اور قدموں میں گر کر خوب رویا۔ اس کا مکان بہت اچھا اور آرام کا تھا۔ ہم سب وہیں ٹھہرے۔ چند روز کے بعد سلطان روم کے نائب کو جو مکہ میں رہتا ہے' ہماری خبر ہوئی تو وہ بھی ہم سے ملنے آیا۔ کسی نے اس سے کہا تھا کہ شاہ دہلی کی لڑکی آئی ہے' جو بے حجابانہ باتیں کرتی ہے۔ نائب سلطان نے عبدالقادر کے ذریعہ سے ملاقات کا پیام دیا' جو میں نے منظور کیا۔ دوسرے دن وہ ہمارے گھر پر آیا اور نہایت ادب قاعدہ سے بات چیت کی۔ آخر میں اس نے خواہش کی کہ میں آپ کے آنے کی اطلاع حضور سلطان کو دینی چاہتا ہوں۔ میں نے اس کا جواب بہت بے پروائی سے دیا کہ اب ہم ایک بڑے سلطان کے دربار میں آ گئے ہیں۔ اب ہمیں کسی دوسرے سلطان کی پرواہ نہیں ہے۔ نائب نے ایک معقول رقم ہمارے اخراجات کے لئے مقرر کر دی اور ہم نو برس وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد ایک سال بغداد شریف' ایک سال نجف و کربلائے معلیٰ میں بسر ہوا۔ اتنی مدت کے بعد دہلی کی یاد نے بے چین کیا اور روانہ ہو کر دہلی آ گئے۔ یہاں انگریزوں کی سرکار نے بہت بڑا ترس کھا کر دس روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ اس پنشن کی رقم کو سن کر اول تو مجھے ہنسی آئی کہ میرے باپ کا اتنا بڑا ملک لے کر دس روپے معاوضہ دیتے ہیں' مگر پھر خیال آیا کہ ملک تو خدا کا ہے کسی کے باوا کا نہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے' جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں۔

☆ ☆ ☆

یتیم شہزادہ کی عید

اس ۱۳۳۲ ہجری کی عید الفطر کا ذکر ہے۔ دہلی میں ۲۹ کا چاند نظر نہ آیا۔ درزی خوش تھے کہ ان کو ایک دن کام کرنے کی مہلت مل گئی۔ جوتے والوں کو بھی خوشی تھی کہ ایک روز کی بکری بڑھ گئی۔

مگر مسلمانوں کے ایک غریب محلہ میں تیموریہ خاندان کا ایک گھرانہ اس دن بہت غمگین تھا۔ یہ لوگ عصر سے پہلے اپنے گھر کے وارث میرزا دلدار شاہ کو دفن کر کے آئے تھے۔

دلدار شاہ دس دن سے بیمار تھے۔ ان کو پانچ روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ گھر میں ان کی بیوی اور یہ خود کناری بنتے تھے جس میں ان کو اتنی معقول آمدنی تھی کہ خوب آرام سے بسر اوقات کرتے تھے۔

ان کے چار بچے تھے۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ دو لڑکیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ ایک ڈیڑھ سال کی لڑکی گود میں تھی اور ایک لڑکا دس برس کا تھا۔

دلدار شاہ اس لڑکے کو بہت چاہتے تھے۔ بیگم نے بہت چاہا کہ لڑکا مکتب میں جائے' مگر دلدار شاہ کو بچہ اس قدر لاڈلا تھا کہ انہوں نے ایک دن اس کو مکتب نہ بھیجا۔

لڑکا سارا دن گلیوں میں آوارہ پھرتا تھا۔ زبان پر گالیاں اس قدر چڑھ گئی تھیں کہ بات بات میں مغلظات بکتا تھا

اور باوا جان اس کی بھولی بھولی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔

میرزا دلدار شاہ بہادر شاہ بادشاہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ مرتے وقت ان کی عمر ۶۵ برس کی ہوگی' کیونکہ جب یہ لڑکا ان کے ہاں پیدا ہوا تو ان کی عمر ۵۵ برس کی تھی۔

بڑھاپے کی اولاد سب کو پیاری ہوتی ہے۔ خاص کر بیٹا۔ میرزا دلدار شاہ جتنی محبت کرتے تھوڑی تھی۔

ایک دن ان کے ایک دوست نے کہا۔ "صاحب عالم! بچہ کے لکھنے پڑھنے کی یہی عمر ہے۔ اب نہ پڑھے گا تو کب پڑھے گا۔ لاڈ پیار بھی ایک حد تک اچھا ہوتا ہے۔ آپ اس کے حق میں کانٹے بوتے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ خدانخواستہ آپ کی آنکھیں بند ہوگئیں تو اس معصوم کا کہیں ٹھکانا نہیں رہے گا۔ لکھ پڑھ لے گا تو دو روٹیاں کما کھائے گا۔ اس زمانہ میں شریفوں کی گذران بڑی دشوار ہوگئی ہے۔ کچھ آئندہ کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کو غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے اور بزرگوں کی ناک کٹے۔"

میرزا دلدار شاہ اس ہمدردی سے بگڑ گئے اور بولے "آپ میرے مرنے کی بدشگونی کرتے ہیں۔ ابھی میری کونسی ایسی عمر ہوگئی ہے۔ لوگ تو سو برس تک زندہ رہتے ہیں۔ رہا بچے کا پڑھانا' سو میرے نزدیک تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے بی اے' ایم اے پاس مارے مارے پھرتے ہیں اور دو کوڑی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میرا بچہ پہلے ہی دھان پان ہے۔ آئے دن کا مریض ہے۔ میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ظالم استادوں کے حوالے کر کے اس کی نازک ہڈیوں کو چھپٹیوں کا نشانہ بناؤں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے' عیش کراؤں گا۔ میں نہ رہوں گا تو خدا رازق ہے۔ وہ چیونٹی تک کو کھانا دیتا ہے۔ پتھر کے کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے۔ آدمی کے بچہ کو کہیں بھوکا مارے گا؟ میاں ہم نے زمانہ کا بڑا گرم و سرد رنگ دیکھا ہے۔ ہمارے ماں باپ نے بھی ہم کو نہ پڑھایا تو کیا ہم بھوکے مرتے ہیں۔"

نصیحت کرنے والے بیچارے یہ جواب سن کر چپ ہوگئے اور دل ہی دل میں پچھتائے کہ میں نے ناحق ان سے دردمندی کی بات کہی' لیکن انہیں خیال آیا کہ حق بات کہنے سے چپکا رہنا گناہ ہے۔ الساکت عن الحق شیطان اخرس یعنی سچی بات کہنے سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے' اس لئے انہوں نے پھر کہا کہ "جناب! آپ ناراض نہ ہوں۔ میں خدانخواستہ آپ کا مرنا نہیں چاہتا۔ میں نے تو ایک دور اندیشی کی بات کہی تھی۔ آپ کو ناگوار گذری تو معاف فرمائیے' مگر یہ تو خیال فرمالیجئے کہ آپ کے بچپن میں اور حالت تھی اور آج کل اور زمانہ ہے۔ اس وقت قلعہ آباد تھا۔ جہاں پناہ ظل سبحانی بہادر شاہ حضرت کا سایہ سر پر تھا۔ ہر بات سے بے فکری تھی' لیکن آج تو کچھ بھی نہیں۔ نہ بادشاہی ہے نہ امیری ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں گدائی اور فقیری ہے۔ اب تو جو ہنرمندی سیکھے گا اور اپنی روٹی اپنے بازو سے کمائے گا وہی لالوں کا لال بنے گا ورنہ ذلت و خواری کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"

دلدار شاہ نے کہا "ہاں یہ سچ ہے۔ میں اس کو سمجھتا ہوں مگر آخر ہماری بھی تو اتنی عمر اسی بربادی کے زمانے میں بسر ہوگئی۔ سرکار نے پانچ روپیہ کی جو پنشن مقرر کی ہے' تم جانتے ہو کہ اس میں ہمارے گے وقت نکلتے ہوں گے۔ آٹھ آنے روز تو بچے کا خرچ ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی روپیہ ڈیڑھ روپیہ کی روز کتاری بنتے ہیں اور مزے سے گذر اوقات کرتے ہیں۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دوسرے صاحب تشریف لائے اور انہوں نے کہا "آسٹریا کے بادشاہ کا ولی عہد مارا گیا۔ جب بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی تو وہ بے قرار ہو گیا اور ہائے کا نعرہ مار کر کہا ظالموں نے سب کچھ لوٹ لیا' میرے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔"

میرزا دلدار شاہ یہ سن کر ہنسنے لگے اور بولے "بھئی واہ اچھی بہادری ہے۔ بیٹے کے ناگہانی مرنے سے ایسے گھبرا گئے۔ میاں جب بہادر شاہ حضرت کے صاحبزادے میرزا ابوبکر وغیرہ گولی سے مارے گئے اور ان کے سر کاٹ کر سامنے لائے تو بادشاہ نے خوان میں کٹا ہوا سر دیکھ کر نہایت بے پروائی سے فرمایا' الحمد للہ سرخ رو ہو کر سامنے آیا۔ مرد لوگ اسی دن کے لیے بچے پالتے ہیں۔"

جو صاحب خبر لائے تھے' وہ بولے "کیوں جناب غدر میں آپ کی کیا عمر ہو گی۔" میرزا دلدار شاہ نے کہا "کوئی چودہ پندرہ برس کی۔ مجھے سب واقعات اچھی طرح یاد ہیں۔ باوا جان ہم کو لے کر غازی آباد جا رہے تھے کہ ہنڈن ندی پر ہم کو فوج نے پکڑ لیا۔ والدہ اور میری چھوٹی بہن چیخیں مار کر رونے لگیں۔ والد نے ان کو منع کیا اور آنکھ بچا کر ایک سپاہی کی تلوار اٹھا لی۔ تلوار ہاتھ میں لینی تھی کہ سپاہی چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے دو چار کو زخمی کیا مگر سنگینوں اور تلواروں کے اتنے وار ان پر ہوئے کہ بچارے قیمہ قیمہ ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔

ان کی شہادت کے بعد سپاہیوں نے میری بہن اور ماں کے کانوں کو نوچ لیا اور جو کچھ ان کے پاس تھا' چھین کر چلتے ہوئے۔ مجھ کو انہوں نے قید کر کے ساتھ لے لیا۔ جس وقت میں والدہ سے جدا ہوا ہوں' ان کی آہ وزاری سے آسمان ہلا جاتا تھا۔ وہ کلیجہ کو تھامے ہوئے چیختی تھیں اور کہتی تھیں۔ "ارے میرے لال کو چھوڑ دو۔ تم نے میرے سرتاج کو خاک میں سلا دیا۔ اس یتیم پر تو رحم کرو۔ میں رنڈیا کس کے سہارے رنڈاپا کاٹوں گی۔ یا اللہ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میرا دلدار کہاں جاتا ہے۔ کوئی اکبر و شاہجہاں کو قبر سے بلائے۔ ان کے گھرانہ کی دکھیا کی بپتا سنائے۔ دیکھو میرے دل کے ٹکڑے کو مٹھی میں مسلے دیتے ہیں۔ ارے کوئی آؤ۔ میری گودیوں کا پالا مجھ کو دلواؤ۔"

چھوٹی بہن آ کا بھائی آ کا بھائی کہتی ہوئی میری طرف دوڑی مگر سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے اور مجھ کو باگ ڈور سے باندھ لیا۔ گھوڑے دوڑتے تھے تو میں بھی دوڑتا تھا۔ ٹھوکریں کھاتا تھا۔ پاؤں لہولہان ہو گئے تے۔ دل دھڑکتا تھا۔ دم اکھڑا جاتا تھا۔"

پوچھا "میرزا یہ بات رہ گئی کہ پھر تمہاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہوا؟"

میرزا نے کہا' آج تک ان کا پتہ نہیں۔ خبر نہیں ان پر کیا گذری اور وہ کہاں گئیں۔ مجھ کو سپاہی اپنے ہمراہ دہلی لائے اور یہاں سے اندور لے گئے۔ مجھ سے وہ گھوڑے ملواتے تھے اور گھوڑوں کی لید صاف کراتے تھے۔

"چند روز کے بعد مجھ کو چھوڑ دیا گیا اور میں نے اندور میں ایک ٹھاکر کے ہاں دربانی کی نوکری کر لی۔ کئی برس اس میں گذارے۔ پھر دہلی میں آیا اور سرکار میں درخواست دی۔ اس کی مہربانی سے میری بھی اوروں کی طرح پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے شادی کی۔ یہ بچے پیدا ہوئے۔" اس واقعہ کے چند روز کے بعد میرزا دلدار شاہ بیمار ہوئے اور دس دن بیمار رہ کر آخرت کو سدھارے۔

ان کے مرنے کا غم سب سے زیادہ ان کی بیوی اور لڑکے کو تھا۔ لڑکا دس برس کا تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ابا جان مر گئے ہیں مگر وہ بار بار اماں سے کہتا تھا کہ ابا جان کو بلا دو۔

الغرض اس رونے دھونے میں یہ سب لوگ سو گئے۔ سحری کو بیگم صاحبہ بیدار ہوئیں تو دیکھا کہ گھر میں جھاڑو ملی ہوئی ہے۔ کپڑا لتا' برتن بھانڈا سب چور لے گئے۔ بیچاری بیوہ نے سر پیٹ لیا۔ ہے ہے اب میں کیا کروں گی۔ میرے پاس تو ایک تنکا بھی نہ رہا۔ گھر کے مالک کے اٹھتے ہی چوری بھی ہوئی۔

آس پاس کے محلہ والے ان کے رونے کی آواز سن کر جمع ہو گئے اور سب نے بہت افسوس کیا۔ پڑوس میں ایک گوٹے والے رہتے تھے۔ انہوں نے سحری کے لئے دودھ اور نان پاؤ بھیجا اور بیچاری نے ٹھنڈا سانس بھر کر اس کو لے لیا۔

یہ پہلا دن تھا کہ بیوہ شہزادی نے خیرات کی سحری کھائی جس کا اس کو سب سے زیادہ صدمہ تھا۔ دن ہوا۔ چاروں طرف عید کے سامان نظر آتے تھے۔ چاند رات کی چہل پہل میں ہر گھر میں تھی مگر نہ تھی تو اس گھر میں جہاں دودھ پیتی بچی کو گود میں لیے بیوہ شہزادی یتیم شہزادہ کو سمجھا رہی تھی کیونکہ وہ نئی جوتی اور نئے کپڑے مانگتا تھا۔ ''بیٹا تمہارے ابا جان پردیس گئے ہیں۔ وہ آ جائیں تو کپڑے منگا دیں گے۔ دیکھو تمہارے دولہا بھائی بھی بنارس گئے ہوئے ہیں۔ وہ ہوتے تو ان سے ہی منگا دیتے۔ اب کس کو بازار بھیجوں۔''

لڑکے نے کہا ''میں خود لے آؤں گا۔ مجھ کو دام دو۔'' دام کا نام سن کر دکھیاری بیوہ کے آنسو آ گئے۔ اس نے کہا ''تمہیں خبر نہیں رات کو گھر میں چوری ہو گئی۔ ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔''

ضدی شہزادہ نے مچل کر کہا ''نہیں میں تو ابھی لوں گا۔'' یہ کہہ کر دو چار گالیاں ماں کو دے دیں۔ مصیبت زدہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر آسمان کو دیکھا اور بولی ''اچھا ٹھہرو میں منگاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر پڑوس کے گھر سے لگی ہوئی کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوئی اور گوٹہ والے کی بیوی سے کہا ''بوا عدت کے دن ہیں۔ میں اندر تو نہیں آ سکتی۔ ذرا میری بات سن جاؤ۔'' وہ بیچاری فوراً اس کے پاس آئی تو اسے سارا ماجرا سنایا اور کہا ''خدا واسطہ کا کام ہے۔ اپنے بچہ کی اترن' کوئی جوتی یا کپڑوں کا جوڑا ہو تو ایک دن کے لیے مانگے دے دو۔ کل شام کو واپس دے دوں گی۔''

شہزادی اترن کہتے وقت بے اختیار ہچکی لے کر رونے لگی۔ پڑوسن کو بڑا ترس آیا۔ اس نے کہا ''بوا رونے اور جی بھاری کرنے کی کچھ بات نہیں۔ ننھے کی کئی جوتیاں اور کئی جوڑے فالتو رکھے ہیں۔ ایک تم لے لو۔ اس میں اترن کا خیال نہ کرو۔ اس نے تو ایک دن یونہی ذرا پاؤں میں ڈالی تھی۔ میں نے سنگوا کر رکھ دی۔''

یہ کہہ کر پڑوسن نے جوتی اور کپڑے شہزادی کو دیے۔ شہزادی یہ چیزیں لے کر بچے کے پاس آئی اور اس کو یہ سب دکھائیں۔ بچہ خوش ہو گیا۔

دوسرے دن عید گاہ جانے کے لیے شہزادی نے اپنے بچے کو بھی گوٹہ والے پڑوسی کے ساتھ کر دیا۔ عید گاہ پہنچ کر یتیم شہزادے نے گوٹہ والے کے لڑکے سے کہا۔ ''اب تیری ٹوپی سے ہماری ٹوپی اچھی ہے۔'' گوٹہ والے لڑکے نے جواب دیا۔

''چل بے اترن کھترن پر اتراتا ہے! لے یہ بھی میری ٹوپی ہے۔ اماں نے تجھ کو خیر خیرات دے دی ہے۔''

یہ سنتا تھا کہ شہزادہ نے ایک زور کا تھپڑ گوٹہ والے کے بچے کے رسید کیا اور کہا ہم کو خیرات خورہ کہتا ہے۔
گوٹہ والے نے جو اپنے بچے کو پٹتا دیکھا تو اس کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے دو تین طمانچے شہزادے کے مارے۔ یہ لڑکا روتا ہوا بھاگا۔ گوٹہ والے نے خیال کیا کہ اس کی ماں کیا کہے گی کہ ساتھ لے گئے تھے۔ کہاں چھوڑ آئے اس لئے وہ اس کو پکڑنے کو دوڑا مگر لڑکا نظروں سے غائب ہو گیا۔ ناچار گوٹہ والا مجبور ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔
اب یتیم شہزادہ کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ عام خلقت کے ساتھ عید گاہ سے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ راستہ میں ایک گاڑی کی جھپٹ میں آ کر گر پڑا اور زخمی ہو گیا۔ پولیس شفاخانہ لے گئی۔
یہاں گھر میں اس کی ماں کا عجب حال تھا۔ غش پہ غش آتے تھے۔ دو وقت سے بھوکی تھی۔ اس پر عید اور یہ مصیبت کہ لڑکا گم ہو گیا اور عالم یہ کہ کوئی پرسان حال نہیں جولڑکے کو تلاش کرنے جائے۔ آخر بچارا وہی گوٹہ والا پھر گیا اور پولیس میں اطلاع لکھوائی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ شفاخانہ میں ہے۔ شفاخانہ جا کر خبر لایا اور شہزادی کو ساری کیفیت سنائی۔ اس وقت عجیب عالم تھا۔
عید کی شام تھی۔ گھر گھر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ مبارک بادوں کے چرچے تھے۔ تحفے تحائف اور عیدیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ ہر مسلمان نے اپنی حیثیت سے زیادہ گھر کو آراستہ کیا تھا اور اپنے بال بچوں کو خوش وخرم لیے بیٹھا تھا' مگر بچاری بیوہ شہزادی دو وقت کے فاقہ سے رنجور' بچہ کے غم میں اشکبار' اندھیرے اجاڑ گھر میں بیٹھی آسمان کو دیکھتی تھی اور کہتی تھی ''خدایا میری عید کہاں ہے؟'' اور بے اختیار ہچکیاں لے کر روتی تھی۔ اُدھر شفاخانہ میں یتیم شہزادہ ماں کی جدائی میں پھڑکتا تھا۔
یہ ہے انقلاب ایام کی سچی تصویر۔ اس میں تقدیر کا نشان۔ اس قصہ سے معلوم ہوگا کہ اولاد کی تعلیم سے غفلت کرنا اور اس کو تربیت نہ دینا کیسا خطرناک ہے۔ یہ سچی کیفیت عبرت ہے' ان لوگوں کے لئے جو عید کی خوشی میں مست و بےخبر ہو جاتے ہیں اور آس پاس کے آفت رسیدہ غریبوں کی حالت نہیں دیکھتے۔

☆ ☆ ☆

پیر جی گھسیارے

حضرت دین علی شاہ قلندر دہلی کے نامی بزرگ تھے۔ فراش خانہ کے باہر ان کا تکیہ اب تک مشہور ہے۔ میں غدر سے پہلے عالم شباب میں سرشار ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔
مجھ کو اپنی پیرزادگی کے گھمنڈ کے ساتھ روپیہ کا غرور تھا۔ صورت شکل کا تکبر تھا اور اپنے زور و قوت پر بہت اکڑتا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ ابا سے زیادہ اماں کو مجھ پر پیار تھا۔ والد خاص بازار میں رہتے تھے اور ان کے ہزار ہا مرید تھے۔ شہزادے شہزادیاں ہر وقت ان کے پاس آتی تھیں۔ نذر نیاز کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ غرض ہم بے تکان مزے اڑاتے تھے' مگر ابا جان کا یہ عالم تھا کہ وہ باوجود اتنی کثیر آمدنی کے ہمیشہ نگینہ سازی کر کے گذر اوقات کرتے تھے۔ مریدوں کے روپے کو ہاتھ

نہ لگاتے تھے۔

ایک دن میں نے والدہ سے پوچھا۔ ''کیوں بی! یہ ابا جی گھر میں سب کچھ ہوتے ساتے نگینے کیوں گھسا کرتے ہیں۔ بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ پھر خواہ مخواہ پاپڑ بیلتے ہیں۔''

اماں جان نے ہنس کر کہا ''بیٹا! ان کا عقیدہ ہے کہ فقیر وہی کامل ہے جو اپنی روٹی اپنے ہاتھ سے کمائے۔ دوسروں کے سہارے پر ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھے۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر مریدوں سے جو ملے وہ غریب مریدوں کا حصہ ہے ہمارا نہیں ہے۔ ہم کو اپنی معاش خود حاصل کرنی چاہئے۔'' میں نے کہا ''تو کیا مریدوں کی نذر نیاز حرام ہے جو وہ نہیں کھاتے۔'' اماں نے کہا ''نہیں حرام تو نہیں ہے مگر وہ ہمارا حق نہیں ہے۔ دوسروں کا حصہ ہے۔ خدا تعالیٰ یہ فتوحات اس لیے بھیجتا ہے کہ ہم اپنے محتاج بھائیوں کی خبر گیری کریں اور خود جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں اپنی روٹی آپ کمائیں۔''

دردانہ چھوکری

اس گفتگو کے تیسرے دن نواب زینت محل صاحبہ بیگم خاص حضور جہاں پناہ محمد بہادر شاہ ابا کی خدمت میں آئیں۔ ان کے ہمراہ ایک پیش خدمت دردانہ نامی تھی۔ جوں ہی اس پر میری نظر پڑی دل میں ایک تیر سا لگا۔ اس نے بھی مجھ کو ایک شوقیہ نظر سے دیکھا مگر دونوں بے بس تھے۔ بات نہ کر سکتے تھے۔

بیگم صاحبہ نے کئی بار دردانہ کہہ کر پکارا تو نام بھی معلوم ہوا ورنہ شاید اس کا موقع ملنا بھی محال تھا کہ میں خود چھوکری کا نام پوچھتا۔

بیگم صاحبہ چلی گئیں۔ میرا حال غیر ہونا شروع ہوا۔ دو رات بالکل نیند نہ آئی۔ روٹی تک چھوٹ گئی۔ ہر چند سوچتا کہ دردانہ سے ملنے کی صورت نکلے مگر کوئی شکل سمجھ میں نہ آتی تھی۔ آخر جب بے قراری حد سے بڑھی تو حسب معمول حضرت دین علی شاہ قلندر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری بپتا ان کی خدمت میں عرض کی۔ انہوں نے تبسم فرمایا اور چپکے ہو گئے۔ دوبارہ سوال کی جرأت نہ ہوئی۔ نامراد گھر کو واپس چلا۔ راستے میں حسینی پتنگ باز ملا جو میرا یار غار تھا۔ اس نے جو اتری ہوئی شکل دیکھی، گھبرا کر پوچھنے لگا ''کہو دوست خیر تو ہے؟ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں اور آنکھوں میں حلقے کاہے سے پڑ گئے ہیں۔'' میں نے کہا ''بھائی! دردانہ چھوکری کی محبت سر پر سوار ہے۔ یہ عجیب قسم کا نیا آزار ہے۔ میں تو اس کوچہ سے واقف بھی نہ تھا۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ تقدیر اس ناشاد جوانی کے ہاتھوں کیسی کیسی رسوائیاں دکھاتی ہے۔ دردانہ کو ملواتی ہے یا ہم کو جان ہار دنیا سے قبرستان بھجواتی ہے۔''

حسینی بولا۔ ''بھئی یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے۔ نصیبن کہاری کی معرفت دردانہ سے مل لو۔ یہ کہاری محل میں آتی جاتی ہے۔ جو کہو گے دردانہ تک پہنچا دے گی۔''

حسینی نے ایسی تجویز بتائی کہ میرے دل کا کانٹا نکل گیا۔ سیدھا گھوسیوں کے محلے میں گیا جہاں وہ کہاری رہتی تھی اور کچھ دے کر اس کو اس پیام رسانی پر راضی کر لیا۔

دوسرے دن وہ کہاری میرے پاس آئی اور دردانہ کا پیام لائی کہ میرا ملنا دشوار ہے جب تک کہ تم کوئی حیلہ نہ کرو

اور وہ یہ ہونا چاہئے کہ شہر کے باہر کہیں چلّہ کرنے بیٹھو۔ میں بیگم صاحبہ کو لے کر وہاں آؤں گی اور پھر ہمیشہ کی آمد و رفت کے موقعے نکال لوں گی۔

دردانہ کی یہ بات میرے ذہن میں آ گئی۔ سیدھا اماں کے پاس گیا اور کہا:

"لو بی! تم ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ باپ کے ورثہ کا خیال نہیں۔ نہ ذکر ہے نہ شغل ہے۔ نہ نماز ہے نہ روزہ ہے۔ یہی دن کچھ حاصل کرنے کے ہیں۔ کچھ سیکھنا ہے تو آج سیکھ لو۔ کل خدانخواستہ ابا کی آنکھیں بند ہوئیں تو یہ دولت دوسرے اَلغتوں کے پاس چلی جائے گی اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ پس آج میں تمہارے ارشاد کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ ابا سے کہو کہ مجھے کچھ بتائیں۔ میں حضرت دین علی شاہ کے تکیے کے پاس چلّہ کروں گا۔"

اماں نے کہا۔ "میاں! مجھے جنگل میں رکھنا منظور نہیں۔ کچھ کرنا ہے تو گھر میں کرو۔ یہ بندی ایک آن تم کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گی۔"

میں نے ہر چند سمجھایا' مگر اماں کے خیال میں نہ آیا۔ آخر ابا کو اس قصے کی خبر ہوئی تو وہ میرے ارادے سے بہت خوش ہوئے اور اماں کو راضی کر کے چند خفی جہراذکار تعلیم فرما کے تکیہ میں بھیج دیا۔ دونوں وقت گھر سے نوکر کھانا دینے آتا۔ خیر خبر دے جاتا اور ہم بے غل وغش اپنے کام میں مصروف رہتے۔

دو جاسوس

چوتھے پانچویں دن کا ذکر ہے۔ میں رات کے وقت بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں دو اجنبی آدمی میرے حجرے میں آئے۔ وہ دریدہ اور کہنہ لباس میں تھے۔ میں نے اشارہ سے کہا "کون ہو؟" بولے "مسافر ہیں۔" مجھ کو کچھ شک ہوا کہ یہ چور نہ ہوں۔ وظیفہ چھوڑ کر پوچھا۔ "یہاں آنے کی کیا غرض ہے۔" بولے "آپ سے تعویذ لینے آئے ہیں۔ دردانہ بیوی نے آپ کا پتہ بتایا تھا۔"

دردانہ کا نام سن کر جان میں جان آ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ میں ان مسافروں کی شکلیں پہچان نہ سکا۔ دل ہی دل میں سوال کر رہا تھا کہ یہ مسافر کون ہیں جو دردانہ کو بھی جانتے ہیں۔

آخر میں نے کہا۔ "آپ دردانہ کو کیوں کر پہچانتے ہو۔" مسافر بولے "بیگم صاحبہ سے سفر خرچ مانگنے گئے تھے۔ وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت ملنسار اور نیک بیوی ہیں۔"

میں نے کہا "تم کس بات کا تعویذ چاہتے ہو؟" انہوں نے کہا "تسخیر کا۔" پوچھا "کس کے لیے؟" ہنس کر بولے "شہزادہ جواں بخت کے واسطے۔"

اب میری حیرت حد سے بڑھ گئی۔ شہزادہ جواں بخت زینت محل کے لاڈلے لڑکے تھے۔ انگریزوں نے میرزا دارا بخت کے مرنے کے بعد میرزا فخرو کو ولی عہد کیا تھا اور زینت محل اس کوشش میں تھیں کہ جواں بخت صاحب تاج ہو۔

میں نے کہا "تو جواں بخت کو کس کی تسخیر مطلوب ہے؟" یہ سن کر مسافروں نے تمنچے نکال لیے اور میری طرف ان کا منہ کر کے بولے۔ "خبردار بھید کسی سے نہ کہنا۔ ہم جواں بخت کے جاسوس ہیں۔ تم سے یہ کام ہے کہ تمہارے والد کے

پاس جو خفیہ کاغذات شاہ عالم کے ہیں اور جن میں شاہی دفینوں کا حال ہے وہ ہم کو لا دو۔ اگر تم نے اس کی تعمیل کا اقرار نہ کیا تو ابھی کام تمام کر دیں گے۔"

تیغے دیکھ کر ذرا گھبراہٹ ہوئی، مگر میں نے اپنے اوسان درست کر کے کہا "مجھے کچھ عذر نہیں بشرطیکہ دردانہ مجھ سے ملنے کا اقرار کریں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں اور انہی سے تم کو کاغذات کا پتہ چلا ہے۔" "ہاں! یہ سچ ہے۔ دردانہ تم سے ملے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ نے اپنا بزرگ راز دار سمجھ کر دفینوں کی یادداشت تمہارے باپ کے پاس امانت رکھ دی تھی اور کہا تھا کہ ضرورت کے وقت میرے لائق جانشینوں کو دے دینا۔"

میں نے پوچھا "تو کیا دردانہ رات کو بھی محل میں رہتی ہے۔" بولے۔ "نہیں۔ آدھی رات کے قریب وہ کشمیری دروازہ کے مکان میں آ جاتی ہے اور وہیں ہم رہتے ہیں۔"

میں نے ان سے مکان کا پتہ دریافت کیا اور اس کے بعد کہا کہ "صاحب! مجھے کاغذات لا دینے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر والد صاحب نے خبر نہیں ان کو کہاں رکھا ہے۔ میں نے تو آج تک ان کا ذکر بھی نہیں سنا۔"

جاسوسوں نے کہا "دیکھو جھوٹ نہ بولو۔ جس دن تم نے دردانہ کو دیکھا ہے اسی دن کاغذوں کا ذکر آ رہا تھا۔"

اب تو میں ذرا پریشان سا ہوا۔ آخر جی کڑا کر کے کہا۔ "صاحب! یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔"

یہ سنتے ہی انہوں نے پھر تیغے نکال لیے اور میری طرف ان کو چھتیایا۔ بدن میں طاقت تھی۔ اوسان درست تھے۔ میں نے لپک کر تیغوں کو پکڑ لیا اور جھٹکا دے کے چھین لیا اور اس کے بعد ایک مکا اس کے اور ایک مکا دوسرے کے اس زور سے مارا کہ وہ چکرا کے گر پڑے اور میں نے دوڑ کر ان کے ہاتھ باندھ دیئے۔ دونوں کو باندھ کر حجرے میں ڈالا اور قفل لگا کر میں کشمیری دروازہ پہنچا۔ کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ جاسوسوں کے بتائے ہوئے مکان پر جا کر آواز دی۔ دردانہ نے پوچھا۔ "کون ہے؟" میں نے کہا "ذرا دروازے پر آؤ۔" دردانہ قریب آئی تو میں نے کہا کہ "ان دونوں صاحبوں نے بھیجا ہے۔ وہ تکیہ کے پاس جو شاہ صاحب آ کر رہے ہیں۔ وہاں بیٹھے ہیں اور شاہ صاحب سے اقرار ہو گیا اس لیے انہوں نے تم کو بلایا ہے کہ آ جاؤ تو کاغذات ابھی مل جائیں گے۔" دردانہ نے کہا "تو ڈولی منگالو۔ چلتی ہوں۔"

میں محلہ میں جا کر ڈولی لے آیا اور کہاروں کو چپکے سے سمجھا دیا کہ خاص بازار لے چلنا۔ چنانچہ دردانہ کو سوار کر کے میں اپنے گھر آیا اور ایک علیحدہ دالان میں سواری کو اتروایا۔ اماں اس وقت سو گئی تھیں۔ ابا بالا خانہ پر تھے۔ اماں کو جگا کر سارا حال کہا۔ وہ ڈریں، مگر میری عاجزی سے چپ ہو گئیں اور میں دردانہ کو دوسرے دالان میں لے گیا۔ چراغ روشن کرتے ہی دردانہ دھک رہ گئی اور بولی "ہائیں تم یہاں کہاں لائے۔"

میں نے کہا "دیکھو صاحب! اب یہ تمہارا گھر ہے۔ اگر تم نے شور و غل مچایا تو جان کی خیر نہیں۔ ان جاسوسوں کو میں نے قید کر لیا ہے اور تم بھی میری قیدی ہو۔ گو میرا دل تمہارا قیدی ہے۔ میں سب حالات سے خبردار ہو گیا ہوں۔ تم رضامندی سے چپ ہو گئیں تو یہ تمہارا گھر ہے۔ بیوی بنا کر رکھوں گا ورنہ تم کو اور ان دونوں کو جان سے مار ڈالوں گا۔"

دردانہ نے کہا "مجھے آپ کے ہاں رہنے میں کوئی عذر نہیں۔ میرا دل تو خود اس کا آرزومند تھا، مگر ان جاسوسوں کو چھوڑ دو ورنہ خیر نہ ہوگی۔ بڑا تہلکہ پڑ جائے گا اگر ان کا بال بیکا ہوا۔" میں نے کہا "اگر ان کو چھوڑ دیا تو میری شکل آئے

گی۔" دردانہ نے کہا" کچھ مشکل نہیں تم ابھی وہاں جاؤ اوران سے کہو کہ اصلی کاغذات تو لا نہیں سکتا۔ان کی نقل لا دیتا ہوں' مگر اس شرط پر کہ دردانہ کے معاملہ پر پردہ ڈال دیا جائے۔"

میں نے کہا کہ" مجھ سے تو یہ نمک حرامی نہ ہو گی کہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے بادشاہ کا بھید دوسروں کو دے دوں۔" دردانہ نے کہا" یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ فرضی باتیں کاغذوں میں لکھ دو۔ انہوں نے اصل کاغذات تھوڑی دیکھے ہیں جو وہ شک کریں گے۔قلعہ کے اندر دفینے ہیں۔ وہ اس کو کھود بھی نہیں سکتے۔صرف یادداشت چاہتے ہیں تا کہ آئندہ کے لیے کام آئے۔"

میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔اسی وقت کہ رات کا ایک بجا تھا' پھر تکیہ پر گیا۔حجرہ سے جاسوسوں کو نکالا اور سارا حال کہا۔وہ بولے کہ" اگر تم ان کاغذات کی نقل دے دو گے تو ہم دردانہ کے معاملہ میں تمہارا ساتھ دیں گے۔"

وہ رہا ہو کر اپنے گھر گئے اور میں نے کہا کہ" کل دوپہر کو نقل آپ کے مکان پر پہنچ جائے گی۔" دوسرے دن صبح سے میں نے نقل شروع کی۔دردانہ اپنی ذہانت سے فرضی مقامات بتاتی جاتی تھی اور میں لکھتا جاتا تھا۔

اتنے میں ابا جان بالا خانہ سے نیچے آئے۔میں ان کی خفگی کے ڈر سے اماں کے پاس چلا گیا۔دردانہ نے جھک کر سلام کیا۔والد اماں کے پاس گئے تو میں وہاں سے بھی اٹھ کر چلا آیا۔اماں نے سارا حال بیان کیا۔ابا یہ حالت سن کر سنانے میں آ گئے اور بولے۔"اب خیر نہیں۔ارے بڑا غضب ہوا۔اور یہ تو چلہ کرنے گیا تھا۔اس مینا کو کہاں سے لے آیا۔اچھا تو میں ان دونوں کا کام تمام کیے دیتا ہوں۔"

یہ سن کر اماں ہاتھ جوڑنے لگیں اور ابا کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ابا سیدھے میرے پاس آئے اور دردانہ کے فرضی بنائے ہوئے کاغذ کو دیکھا تو مسکرائے اور بولے" بھئی خوب جل دیا ہے۔خیر تمہاری مرضی۔"

والد باہر گئے۔میں سیدھا جاسوسوں کے مکان پر پہنچا اور کاغذ ان کو دیا' جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ جواں بخت کو تخت مل گیا تو نہال کر دیا جائے گا۔اس کے بعد میں گھر آیا اور دردانہ سے نکاح کر کے ہنسی خوشی رہنے لگا۔

غدر

چند روز کے بعد غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔والد صاحب غدر سے پہلے اپنے ایک مرید کے ہاں انبالہ چلے گئے تھے۔ میں اور دردانہ بھی ساتھ تھے۔

جب غدر کا فتنہ فرو ہوا تو انبالہ ہی میں والد صاحب نے رحلت فرمائی اور میں دہلی میں واپس آیا۔مگر یہاں دیکھا تو خاص بازار کھد کر زمین کے برابر ہو چکا تھا۔ناچار ایک مکان کرایہ کو لیا اور اس میں رہنا شروع کیا۔

اب والد کے جتنے مرید و معتقد تھے' وہ یا تو جلاوطن ہو گئے تھے یا پھانسیاں پا گئے تھے یا غریب و مفلس ہو گئے تھے۔مجھ کو ان سے امداد کا کوئی موقع نہ رہا تھا اور خود کچھ کام نہ آتا تھا جو گذر اوقات کی سبیل ہوتی۔کچھ دن تو پچھلا اندوختہ خرچ ہوتا رہا۔اس کے بعد تنگی شروع ہوئی۔دو ایک فاقے بھی ہوئے۔اب ہمارے دو بچے بھی تھے اور دردانہ بہت فضول خرچ واقع ہوئی تھی۔آخر دردانہ کے مشورہ سے ہم نے پھر چلہ کی ٹھانی اور اسی پرانے حجرہ میں جا کر آسن جمایا۔چند روز کے بعد

ہندو عورتیں تعویذ گنڈے کے لیے آنے لگیں اور صبح سے شام تک روپیہ سوا روپیہ کی آمد ہونے لگی۔

پانچ پیسہ کا تعویذ دیتا اور پانچ آنہ کا گنڈا۔ یہ معمول ہو گیا تھا۔

ایک دوپہر کو سوتا تھا کہ خواب میں حضرت دین علی شاہ قلندر اور اپنے والد کو دیکھا کہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور کہتے ہیں دیکھو میں نے ساری عمر نگینہ سازی کی اور میرا بیٹا دوسرے کی کمائی پر ذلیل اوقات بسر کرتا ہے۔

آنکھ کھلی تو بے اختیار رونا آ گیا۔ سید ھا دردانہ کے پاس آیا اور سارا حال اس سے کہا۔ دردانہ نے کہا "خواب خیال ہے۔ اب یہ نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کام کچھ آتا نہیں۔"

میں نے کہا "نوکری کروں گا۔" یہ ٹھان کر نوکری کی تلاش شروع ہوئی اور ایک مکتب میں دس روپیہ ماہوار کی ملازمت کر لی۔

اسی زمانہ میں دردانہ بیمار ہوئی۔ ہر چند علاج کیا مگر جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے مرنے نے مجھ پر بچوں کی پرورش کا بوجھ ڈال دیا۔ نوکری پر جاتا تھا تو بچوں کو ساتھ لے جاتا۔ بازار میں روٹی کھاتا۔ غرض اسی طرح بمشکل ایک سال گذرا۔

پکانے والی ماما

مکتب میں میری ترقی ہو گئی۔ بیس روپے ملتے تھے اور شام کو دو لڑکے گھر پر پڑھنے آتے تھے۔ تیس روپے میرے لیے بہت تھے' اس لیے ایک دن یہ خیال ہوا کہ کسی پکانے والی ماما کو نوکر رکھنا چاہیے۔ بغیر اس کے گذارا مشکل ہے۔

اسی تلاش میں تھا کہ ایک دن ایک غریب عورت برقعہ اوڑھے بھیک مانگنے آئی۔ میں نے کہا "نیک بخت نوکری کر لے بھیک مانگنا بہت برا ہے۔" اس عورت نے رونے کی آواز میں کہا "میاں تم ہی نوکر رکھ لو۔ سب ضمانت مانگتے ہیں۔ میں کہاں سے ضمانت لاؤں۔"

میں نے کہا "تم کون ہو۔ تمہارا کوئی والی وارث بھی ہے؟" اس نے بے اختیار ہچکیاں لے کر رونا شروع کیا اور کہا "سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ زیادہ نہ پوچھو کہ مجھ میں بیان کی تاب نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو ہمارے ہاں روٹی پکایا کرو۔" اس نے قبول کیا اور روٹی پکانے لگی' مگر ہمیشہ وہ پردے کا خیال رکھتی تھی اور کبھی میرے سامنے نہ آتی تھی' لیکن ایک دن اتفاق سے میری نگاہ اس پر پڑ گئی۔ دیکھا تو جوان اور قبول صورت تھی۔ میں نے اس سے کہا "صاحب بڑی مشکل ہے۔ تمہارے پردے سے تو جی گھبراتا ہے۔ کیوں نہ تم مجھ سے نکاح کر لو تا کہ یہ حجاب اٹھ جائے۔" ماما نے کچھ رک کر آخر اقرار کر لیا اور میں نے اس سے نکاح پڑھا لیا۔

نکاح کے بعد میں نے اس کو دیکھا تو کچھ صورت آشنا سی نظر آئی' مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے پہلے اس کو کہاں دیکھا ہے۔ آخر اس نے خود ہی کہا "تم کو شاید یاد نہ ہو۔ میں بچپن میں اماں جان کے ساتھ تمہارے گھر میں بہت آیا کرتی تھی۔ میں بہادر شاہ بادشاہ کی نواسی ہوں۔ گوہر بیگم میرا نام ہے۔" گوہر بیگم سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا کی شان یہ وہی شہزادی تھی جس کے بڑے چاؤ چوچلے تھے۔ اپنی اماں کی اکلوتی تھی اور ہمارے ہاں بڑی شان و شوکت سے آیا کرتی تھی۔

میں نے پوچھا ''آخر بتاؤ تو سہی تم پر غدر میں کیا بیتی اور تم اب تک کہاں کہاں رہیں۔''

شہزادی کی آپ بیتی

غدر میں میری عمر تیرہ سال کی تھی۔ غدر ہی کے اندر اماں جان کا انتقال ہو گیا اور میں بڑی دائی کے پاس رہتی تھی۔ جب بادشاہ دہلی سے بھاگے تو دائی مجھ کو لے کر انگریزی جرنیل کے پاس چلی گئی اور سارا حال بیان کیا۔ اس نے بہت محبت سے اپنے خیمہ میں مجھ کو رکھا اور دوسرے دن ایک پنجابی مسلمان افسر کے حوالے کر دیا۔ وہ افسر مجھ کو لیے ہوئے لکھنؤ گیا۔ وہاں اس زمانہ میں لڑائی ہو رہی تھی' جس میں افسر بیچارا مارا گیا اور میں بھاگ کر اُناؤ چلی گئی۔ اُناؤ میں ایک ہندو نے اپنے گھر میں رکھا' مگر اس کی نیت بد دیکھ کر میں وہاں سے بھاگی۔ راستے میں ایک دیہاتی زمیندار ملا اور مجھ کو اپنے گھر لے گیا اور چند روز کے بعد اپنے لڑکے سے میری شادی کر دی' مگر مجھ کو ان گنواروں میں رہنا دوبھر تھا۔ بس دوزخ کا مزہ آتا تھا۔ خدا کی قدرت گنواروں میں دھان کے کھیت پر لڑائی ہوئی اور میرے شوہر اور سسرے کو دشمنوں نے مار ڈالا اور میں اس گھر سے نکل کر کان پور آئی۔ یہاں ایک سوداگر کے ہاں ماما گیری کی نوکری کر لی۔ یہ سوداگر بڑا بدچلن تھا۔ مجھ سے تو اس نے کچھ نہ کہا مگر رات دن اس کے ہاں حرام کار عورتوں کی آمد و رفت رہتی تھی جس سے میرا جی بیزار ہو گیا اور میں نے چاہا کہ دہلی چلی جاؤں۔ چنانچہ ایک موقع پر اسٹیشن پہنچی اور بابو سے خوشامد کی کہ مجھے دہلی پہنچا دو۔ اس نے مال گاڑی میں گارڈ کے سپرد کر دیا جس نے مجھ کو دہلی لا کر اتار دیا۔

دہلی میں آئی تو حیران تھی کہ الٰہی کہاں جاؤں۔ کوئی جان پہچان نہ تھی۔ سوچتے سوچتے چیلوں کے کوچہ میں آئی جہاں میرا اَنّو کہار رہتا تھا۔ انّو کہار تو مر گیا تھا۔ اس کی بیوی نے میرا حال سنا تو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بیٹے مچھلیاں پکڑتے تھے۔ ڈولی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے گھر روٹی پکاتی تھی۔

ایک دن رات کو کہار کے لڑکے نے کہا ''یہ امیر لوگ بھی بڑے آرام سے ہیں۔ دھوپ میں مچھلیاں تو ہم پکڑیں اور یہ مزے سے بیٹھ کر کھائیں۔'' میں نے کہا ''دام بھی تو دیتے ہیں اور دام کمانے میں ان کو تم سے زیادہ محنت اور فکر کا شکار ہونا پڑتا ہو گا۔''

کہار یہ سن کر بگڑ گیا اور بولا ''چل ری۔ تو ہماری بات میں دخل دینے والی کون۔'' یہ کہہ کر ایک بانس میرے سر پر مارا۔ سر پھٹ گیا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ہوش آیا تو دریا کی ریت میں پڑی تھی اور آس پاس کوئی نہ تھا۔ چلنے جلنے کی طاقت نہ تھی۔ ہندو عورتیں جمنا پر نہانے جا رہی تھیں۔ میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مجھے شفاخانہ پہنچا دو۔ میرے چوٹ لگ گئی ہے۔ انہوں نے رحم کھا کے ڈولی منگا دی اور میں شفاخانہ آئی۔ وہاں علاج ہوا اور اچھی ہو کر صدر بازار میں پہنچی۔ وہاں ایک پنجابی کے ہاں روٹی پکانے کی نوکری کر لی۔

غرض اس طرح یہ دن بسر ہوئے۔ پنجابی بھی بہت بدچلن تھا۔ اس کی بری نگاہیں دیکھ کر میں نکل آئی اور بھیک مانگنے لگی' کیونکہ دو چار جگہ نوکری کو کہا تو انہوں نے ضمانت مانگی۔

ایک دن بھیک مانگ رہی تھی کہ ایک لڑکا روٹی دینے آیا۔ مجھ کو اس کی صورت دیکھ کر کچھ محبت سی آئی۔ پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میری اماں روٹی پکاتی ہیں۔ میں نے کہا ان کا کیا نام ہے؟ بولا رقیہ۔ رقیہ نام سن کر مجھے شک ہوا کہ شاید میری پھپھی ہیں۔ اندر گھر میں چلی گئی۔ دیکھا تو واقعی پھپھی جان تھیں۔ پھپھی جان نے مجھ کو پہچانا۔ گلے مل کر خوب روئیں اور اپنے پاس ٹھہرالیا۔ چند روز میں نے ان کے ساتھ کام کیا' مگر ایک دن اس گھر میں کچھ چوری ہوگئی۔ صاحب خانہ نے پولیس کو بلا کر کہا کہ یہ اجنبی عورت ہمارے ہاں آئی۔ اسی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ پولیس والے مجھ کو کوتوالی لے گئے اور وہاں مجھ پر تنبیہ شروع ہے۔ ایک نے میری چوٹی پکڑ کر گھسیٹا۔ اس وقت میں نے آسمان کو دیکھا کہ میں ہندوستان کے شہنشاہ کی نواسی ہوں۔ میں چور نہیں ہوں۔ مجھے یہ کیوں ستاتے ہیں۔ الٰہی میرا دنیا میں کوئی حمایتی نہیں۔ میں کس سے کہوں کہ بے قصور ہوں۔ یہ سوچ رہی تھی کہ سپاہی نے جوتیاں مارنی شروع کیں۔ یہ ذلت ایسی سخت تھی کہ مجھ کو غش آ گیا۔ آخر تھانہ دار نے رحم کھا کے مجھ کو چھوڑ دیا اور میں بھیک مانگتے مانگتے آپ کے ہاں آ گئی۔

پیرجی گھسیارے

میں اپنے ماما اور حال کی بیگم کا افسانہ سن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ دنیا میں بھی کیا کیا انقلابات پیش آتے ہیں مگر دنیا والے ذرا نہیں گھبراتے۔ نہ اچھے وقت کا کچھ اعتبار ہے نہ برے وقت کا۔ ایک سا وقت کسی کا نہیں رہتا۔ انسان کو نہ خوشی میں اترانا چاہیے نہ تکلیف میں گھبرانا۔

چند روز ہم بہت ہنسی خوشی سے رہے مگر اتنے میں میرے کتب کی نوکری جاتی رہی۔ ذرا سے قصور پر مجھ کو موقوف کر دیا گیا۔ لڑکوں نے بھی جو میرے پاس پڑھنے آتے تھے آنا چھوڑ دیا۔

اب پھر معاش کی تنگی ہوئی۔ جگہ جگہ نوکری کی تلاش کو گیا' مگر کہیں دستیاب نہ ہوئی۔ لوگ کہتے میاں آج کل بڑے بڑے بی اے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی دو کوڑی کو نہیں پوچھتا۔ اس حالت میں ایک دن میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں زیارت کو گیا۔ واپسی میں دیکھا کہ ایک گھسیارہ گھوڑے پر گھاس لادے چلا جاتا ہے۔ میں نے راستہ کاٹنے کو اس سے باتیں شروع کیں۔

پوچھا کیوں بھئی یہ گھاس کتنے کو بک جائے گی؟ اس نے کہا تین ساڑھے تین روپے کو۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا اوہ! اس میں تو بڑا نفع ہے۔ گھسیارہ نے کہا محنت بھی تو ہے۔ صبح چار بجے گیا تھا۔ اب چار بجے شام تک اتنی جمع ہوئی ہے۔ میں نے کہا جنگل سے مفت لاتے ہو یا کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس نے کہا چالیس روپے کا ایک جنگل ٹھیکے پر لیا ہے۔ وہیں سے لاتا ہوں۔ ایک جنگل چھ مہینے کے لیے کافی ہے۔ ایک رخ سے کھودتا ہوں۔ دوسرے دن دوسری جانب سے۔ تیسرے دن اور طرف سے۔ اس طرح یہ پھیر بندھا رہتا ہے کہ جب اول دن کی کھدی زمین کو آٹھ دن ہو جاتے ہیں تو نئی گھاس پیدا ہو جاتی ہے اور میرا رزق از سر نو وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ آٹھ آنہ روز گھوڑے کا خرچ ہے۔ تین روپیہ کا مکان ہے۔ باقی گھر کے کام آتا ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ ایک بیوی ہے۔ اگر بچے بھی ہوتے تو اتنی بچت نہ ہوتی۔ کچھ وہ کھودتے کچھ میں۔ دوپہر سے پہلے گھوڑے کا بوجھ ہو جاتا۔

یہ سن کر میں گھر آیا اور سارا حال بیوی سے کہا۔ اس نے کہا گھانس کھودنے میں کچھ عیب نہیں۔ بڑے بڑے بزرگوں نے یہ پیشہ کیا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے بیوی کا زیور بیچ کر ایک ٹٹو خریدا۔ جنگل جا کر ایک زمین ٹھیکہ لی۔ تین کھرپے خریدے اور بچوں کو لے کر گھاس کھودنے گیا۔ چند روز تو ذرا مشکل رہی مگر پھر عادت ہوگئی۔ اب ہم تینوں باپ بیٹے دو پہر سے پہلے گھوڑا بھر لاتے ہیں اور گھاس کی منڈی میں دکاندار کے ہاتھ جس سے ٹھیکہ ہو گیا ہے' کھڑے کھڑے تین روپے کو گھاس فروخت کر کے گھر آ جاتے ہیں۔ پھر میں مسجد میں جاتا ہوں اور شام تک اللہ اللہ کر کے مگن رہتا ہوں۔ سینکڑوں عورت مرد تعویذ گنڈے کو آتے ہیں اور میں مفت تعویذ تقسیم کرتا ہوں جس میں اللہ اثر دیتا ہے۔

لوگ میرے گھسیاری پیشے سے آگاہ ہیں اور بجائے نفرت کرنے کے سمجھتے ہیں کہ میں کوئی بڑا پہنچا ہوا فقیر ہوں جو اکل حلال کے لیے گھانس کھودتا ہوں۔ اس واسطے ان کے دل میں میری بڑی عزت وقدر ہے۔ پچھتر روپے ماہوار اس پیشہ میں ملتے ہیں اور کالج کے بی اے پاس لوگوں سے میری اچھی گذر جاتی ہے۔ جن کو پچیس روپے کی غلامی بھی نصیب نہیں۔

☆ ☆ ☆

ٹھیلہ والا شہزادہ

۱۹۱۱ء کے دربار میں دہلی کے دن پھرے۔ نئے شہر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ نقشے بنے۔ نامور انجینئروں کی دماغ آرائیاں اپنے جوہر دکھانے لگیں۔ شاہان اودھ کی مورث منصور علی خاں صفدر جنگ کے مقبرہ کے آس پاس کئی اینٹ بنانے اور پکانے کے کارخانے جاری ہوئے۔ ہزاروں غریبوں کا روزگار چمکا۔ پکی ہوئی اینٹوں کے انبار ریل گاڑیوں اور ٹھیلوں میں سوار ہو کر امپریل سٹی (شہنشاہی شہر دہلی) کی تعمیرات میں جانے لگے۔

۱۱ مئی ۱۹۱۷ء کا ذکر ہے۔ ٹھیک دو پہر کی دھوپ اور حواس کھونے والی گرمی میں ایک بوڑھا ٹھیلے والا خان بہادر سیٹھ محمد ہارون کے بھٹہ سے اینٹیں لے کر دہلی جا رہا تھا۔ سر پر سورج کی تیز کرنیں' سفید داڑھی اور مونچھوں پر راستہ کا گرد و غبار' پیشانی پر پسینہ جس میں اینٹوں کی سرخی جمی ہوئی۔

پیچھے سے ایک موٹر (غالباً قطب صاحب سے) آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ہر چند بگل بجایا' مگر بوڑھے اور بہرے ٹھیلہ والے نے اس کی آواز نہ سنی اور ٹھیلہ کو سڑک سے نہ بچایا۔ موٹر قریب آئی اور ٹھیلے سے ٹکرائی۔ ڈرائیور بہت ہوشیار تھا۔ ٹکر لگتے لگتے موٹر کو روک لیا اور ٹھیلہ کی ٹکر سے موٹر کو کچھ نقصان نہ پہنچا۔

اس موٹر میں ایک پنجابی سوداگر جوانی اور شراب کے نشے میں چُور کسی بازاری عورت کو لیے بیٹھا تھا۔ ٹھیلہ والا کو غریب بوڑھا اور کمزور دیکھ کر غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ ہاتھ میں بطور فیشن کے ایک کوڑا تھا۔ اسی کو لیا۔ موٹر سے اترا اور بیچارے ٹھیلہ والے کو مارنے لگا۔

ٹھیلہ والا اکیلا تھا۔ ضعیف و ناتواں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مفلس اور نادار تھا' مگر خبر نہیں دل میں کیا ہمت

اور جرأت رکھتا تھا کہ چار کوڑے تو پہلے حملے میں اس نے کھا لیے' لیکن پھر بیل ہانکنے کا چابک لے کر اس نے بھی اس مخمور نوجوان پر حملہ کیا اور چابک کے بانس کا ڈنڈا ایسا مارا کہ شرابی عیاش کا مغز پھٹ گیا۔ موٹر ڈرائیور نے چاہا کہ اس بوڑھے کو سزا دینے کو آگے بڑھے' مگر قدم بڑھانے سے پہلے ہی چابک کی لکڑی اس کے سر پر بھی پڑی' جس نے اس کا چہرہ بھی خون سے لال کر دیا۔ موٹر نشین طوائف نے گھبرا کر رونا شروع کیا اور بلبلا کر چیخی کہ خدا کے لیے تم موٹر میں آ جاؤ ورنہ یہ گنوار تم کو جان سے مار ڈالے گا۔

یہ سن کر جوان اور موٹر بان دونوں موٹر میں بیٹھ گئے اور ٹھیلہ والے کو گالیاں دینے لگے۔ بوڑھا خاموش کھڑا مسکراتا رہا اور کہتا رہا کہ بس ایک ہی وار میں بھاگ نکلے۔ تیموری طمانچہ کھانا آسان نہیں ہے۔

ٹھیلہ والا اس قدر بہرہ تھا کہ موٹر والوں کی گالیاں اس نے نہ سنیں اور پھر ٹھیلہ پر آن بیٹھا۔ موٹر بھی دہلی چلی گئی اور ٹھیلہ بھی رسینہ (وہ مقام جہاں نئی دہلی کی تعمیر ہو رہی ہے) میں کہیں اینٹیں ڈالنے روانہ ہو گیا۔

(۲)

رسینہ کے تھانے میں دوسرے دن دو زخمی اور چند ٹھیلے والے جمع تھے۔ وہ بوڑھا ٹھیلے والا بھی کھڑا تھا۔ داروغہ پولیس نے پوچھا " کیا تم نے ان کو زخمی کیا ہے؟"

بوڑھا چپ کھڑا رہا۔ داروغہ نے پھر ذرا بگڑ کر سوال کیا اور کہا کہ " بولتا کیوں نہیں۔"

دوسرے ٹھیلے والے بولے " حضور! یہ بہرا ہے۔" تب ایک سپاہی نے بوڑھے کے کان کے پاس جا کر آواز سے یہی سوال کیا تو بوڑھے نے جواب دیا " ہاں میں نے مارا ہے۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ چار کوڑے مارے تو میں نے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ یہ امیر لوگ غریبوں کو گھاس پھوس سمجھتے ہیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے ان زخمیوں کے ماں باپ میرے غلام تھے اور یہی نہیں سارا ہندوستان میرا محکوم تھا۔"

داروغہ پولیس ہنسا اور اس نے کہا شاید یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بڑھاپے نے اس کی عقل کھو دی۔ اچھا اس کو حوالات میں لے جاؤ۔ کل عدالت میں چالان کیا جائے گا۔ ایسے دیوانہ کو پاگل خانہ بھیجنا چاہیے۔

(۳)

سٹی مجسٹریٹ کے ہاں بوڑھا ٹھیلہ والا پولیس کی حراست میں حاضر تھا اور دونوں مدعی بھی موجود تھے۔ کورٹ انسپکٹر نے واقعات پیش کیے تو عدالت نے مدعا علیہ کا بیان لینا چاہا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بہرا ہے' چپراسی نے چیخ چیخ کر اس کا اظہار لیا۔ بوڑھے نے بیان کیا:

" میرا نام ظفر سلطان ہے۔ میں مرزا بابر برادر بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میرے دادا ہندوستان کے شہنشاہ معین الدین اکبر شاہ ثانی تھے۔ غدر کے بعد میں ہزاروں پریشانیوں کے بعد ملکوں ملکوں پھرتا ہوا پھر دہلی میں آ گیا اور ٹھیلا چلانے کا کام کرنے لگا۔ ۱۱ مئی ۱۹۱۷ء جو ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی طرح گرم اور سخت تھی اس واقعہ کی تاریخ ہے۔ میں بہرا ہوں۔

میں نے موٹر کی آواز نہیں سنی۔ موٹر والوں نے میری عمر اور حالت پر رحم نہ کیا اور میرے چار کوڑے مارے۔ میرے بدن میں جو خون ہے اس کو مار کھانے کی اور ظلم و جور سہنے کی اب تو عادت ہوگئی ہے مگر پہلے نہ تھی۔ جس جگہ عدالت کی کرسی ہے اسی مقام پر غدر سے پہلے میرے حکم سے بارہا بہت سے شریروں اور سرکشوں کو سزائیں دی گئی ہیں۔ میرے دل اور دماغ نے ان عادتوں کو فراموش نہیں کیا۔ گو میری آنکھوں نے ان نظاروں کی دید مدت سے ترک کردی ہے۔ میں کیونکر چار کوڑوں کو برداشت کرسکتا تھا۔ میں نے بے شک بدلہ لیا اور ان دونوں بہادر جوانوں کے سر پھاڑ ڈالے۔ اگر آپ شریف لوگوں کا انصاف کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کو تیار و آمادہ ہوں۔"

بوڑھے کی تقریر سن کر عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب جو یورپین تھے قلم منہ میں لے کر بوڑھے کو دیکھنے لگے اور ان کا مسلمان سررشتہ دار آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ دونوں مدعی بھی یہ بیان سن کر دم بخود رہ گئے۔

عدالت نے حکم دیا۔ تم کو رہا کیا جاتا ہے اور مدعیوں پر دس دس روپے جرمانہ کیونکہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے کہ انہوں نے نشہ کی حالت میں پہلے مدعا علیہ پر حملہ کیا تھا۔

اس کے بعد مجسٹریٹ نے چپراسی کے ذریعہ بوڑھے شہزادے سے پوچھا "کیا تمہاری پنشن سرکار سے مقرر نہیں ہوئی۔ تم ٹھیلے کا ذلیل کام کیوں کرتے ہو۔"

شہزادہ نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے کہ انگریزی سرکار نے ہمارے خاندان والوں کی پانچ پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کردی ہے مگر میں اول سے تو برسوں دہلی سے غیر حاضر رہا۔ اس کے علاوہ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں کام کر کے محنت کی روزی کمانی فرض سمجھتا ہوں۔ جناب! مجھ کو ٹھیلہ میں تین چار روپے روزانہ مل جاتے ہیں۔ دو روپے روز بیلوں وغیرہ کا خرچ ہے جس میں گھر کا کرایہ بھی شامل ہے اور روپیہ دو روپیہ مجھ کو بچ جاتے ہیں۔ میں پانچ روپے مہینہ لے کر کیا کرتا۔ آج کل میں بہت خوش ہوں اور مجھ کو ہر طرح کی آزادی اور بے فکری ہے۔ جو لوگ آپ کی کچہریوں میں نوکریاں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور بی اے ایم اے پاس ہونے میں عمریں برباد کرتے ہیں ان سے مجھ ٹھیلہ والا کی حالت لاکھ درجہ بہتر ہے۔ ٹھیلا چلانے میں کچھ ذلت نہیں ہے کیونکہ میں بیلوں پر حکومت کرتا ہوں اور خود بیل بن کر محکوم نہیں بنتا۔"

(۴)

ٹھیلہ والا شہزادہ پہاڑ گنج کی مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا اور اسی کے قریب اس کا گھر تھا۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو ایک شخص اس کے پاس گیا اور کہا "میں آج کچہری میں موجود تھا اور میں نے آپ کے بیان کا چرچا سنا تھا۔ کیا آپ غدر کے حالات سنا سکتے ہیں کہ آپ غدر میں اور اس کے بعد کہاں کہاں رہے اور آپ پر کیا کیا مصیبت پڑی۔"

ٹھیلے والے نے مسکرا کر کہا "کیا آپ وہ حالات سن سکتے ہیں؟ اور کیا آپ کو ان جھوٹی باتوں پر یقین آسکتا ہے؟ کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو بات گزر جائے خواہ وہ خوشی کی ہو یا تکلیف کی ہو جھوٹی ہے۔ اس کا بیان کرنا جھوٹ بولنا ہے۔ آنے والا زمانہ وہم ہے۔ گذرنے والا وقت جھوٹا ہے اور موجودہ گھڑی سچی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جو وقت سامنے ہے اس پر یقین کروں اور ہنسی خوشی اس کو گذار دوں۔ نہ گذرے وقت کی یاد دل میں آنے دوں۔ نہ آنے والے زمانے کا

فکر ذہن میں لاؤں۔ بس جو کچھ سمجھوں اسی وقت کو سمجھوں جو آنکھوں کو نظر آتا ہو اور جس میں موجودہ سانس کی آمد و رفت ہو۔"

سائل نے کہا "یہ تو آپ کی ذاتی تجربہ کی باتیں ہیں۔ آپ کے دل کو صدموں اور حادثوں نے دنیا سے اداس کر دیا ہے مگر میں تو واقعات غدر کی یادداشت مرتب کرنے کو آپ سے یہ حالات پوچھتا ہوں۔ میں نے اور بھی اسی طرح بہت سے واقعات جمع کیے ہیں اور آپ بیتی کیفیت شہزادوں سے پوچھ پوچھ کر لکھی ہے۔"

یہ سن کر شہزادہ نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا "شاید آپ اخبار والے ہیں؟ میں ان لوگوں سے سخت بیزار ہوں۔ یہ بہت ہی جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ اچھا آپ میرے گھر پر چلئے۔ میں مہمان کی دل شکنی نہیں کروں گا اور آپ جو پوچھیں گے بتاؤں گا۔"

شہزادہ سائل کو لے کر اپنے گھر میں گیا۔ چھپر کا ایک مکان تھا۔ باہر صحن میں دو بیل اور ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ اندر دالان میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ برابر ایک پلنگ تھا۔ دونوں پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں، جن سے غریب مگر محنتی اور کماؤ شہزادہ کی نفاست مزاجی ظاہر ہوتی تھی۔ شہزادہ نے سائل کو تخت پر بٹھایا اور خود باورچی خانہ سے کھانا لایا اور کہا آؤ پہلے کھانا کھالو۔ پھر باتیں کریں گے۔ کھانا اگرچہ ایک آدمی کا تھا، مگر دو قسم کا سالن، دال چٹنی اور کچھ میٹھا۔ اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ شہزادہ اس حالت میں بھی مکلف زندگی بسر کرتا ہے۔ سائل نے ہر چند عذر کیا، مگر شہزادہ نہ مانا اور دونوں نے کھانا کھایا اور پھر شہزادہ نے خود حقہ بھرا اور سائل کے آگے رکھا۔ اس نے حقہ نہ پینے کا عذر کیا، تو شہزادے نے نَے کو آگے رکھ کر یہ داستان کہنی شروع کی۔

(۵)

میں میرزا بابر کا بیٹا ہوں۔ میرزا بابر بہادر شاہ کے بھائی تھے۔ غدر سے پہلے بہادر شاہ کی حکومت تو ہندوستان میں نہ تھی، مگر عزت بادشاہوں کی سی ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر آبادی میں ان کے نام کی کی جاتی تھی اور دلی میں تو ہر شخص بہادر شاہ اور ان کے خاندان کا وہی ادب و لحاظ کرتا تھا جو شاہ جہاں اور عالمگیر کے وقت میں ہوتا تھا۔

میں اپنے باپ کا بہت لاڈلا بیٹا تھا۔ اگرچہ ان کے اولاد اور بھی تھی، مگر اپنی ماں کا میں اکلوتا تھا۔ میرے والد کا غدر سے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ جب غدر پڑا اور باغیوں کی فوج دلی میں گھسی تو جیسی ستم کاریاں اس نے انگریزوں اور ان کی عورتوں و بچوں پر کیں، ان کے کہنے سے کلیجہ کانپتا ہے۔ اس کے بعد جب انگریز پنجاب کی مدد لے کر دلی پر آئے اور اس کو مغلوب کر لیا تو بادشاہ سمیت سارا شہر بھاگ نکلا۔ میری والدہ نابینا تھیں اور آئے دن کی بیماریوں سے بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ رتھ میں سوار ہونا بھی ان کو دوبھر تھا، مگر دو عورتوں کی مدد سے میں نے ان کو سوار کیا اور خود بھی اس میں سوار ہو کر دلی سے نکلا۔ بادشاہ وغیرہ تو مقبرہ ہمایوں گئے تھے مگر میں نے کرنال کا رخ کیا کیونکہ وہاں میرے ایک دوست رہتے تھے جن سے دلی میں اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ کرنال کے علاقہ میں صاحب حیثیت زمیندار تھے۔

ہمارا رتھ اجمیری دروازہ سے باہر نکلا (راستہ تو لاہوری دروازے سے تھا، مگر ادھر انگریزی فوج کا ڈر تھا) تو

دیکھا ہزاروں عورت مرد بچے بوڑھے پوٹلیاں سروں پر رکھے حیران و پریشان چلے جا رہے تھے۔ رتھ والے نے کہا گوڑ گانوہ ہوکر کرنال چلنا چاہیے تا کہ فوج والوں کے ہاتھ سے امن رہے گا۔ گوڑ گانوہ تک تو ہم امن سے چلے گئے۔ اگر چہ راستہ میں گوجر وغیرہ ملے مگر ہم حیلہ حوالے کر کے ان کے ہاتھوں سے بچ گئے لیکن گوڑ گانوہ سے جب کرنال کی طرف مڑے تو دو کوس کے بعد ہی گوجروں کے ایک غول نے رتھ کو گھیر لیا اور لوٹنا چاہا۔ ابھی انہوں نے ہاتھ نہ ڈالا تھا کہ سامنے سے ایک انگریزی فوج کا دستہ آ گیا۔ یہ سب گورے تھے۔ ان کو دیکھ کر گوجر تو بھاگ گئے اور گورے گھوڑے دوڑا کر رتھ کے پاس پہنچے اور انہوں نے مذاق کے انداز سے انگریزی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا جس کو میں نہیں سمجھا۔ میں مشرقی رخ تھا۔ مغربی رخ سے ایک گورے نے رتھ کا پردہ اٹھا کر دیکھا اور والدہ کو نابینا اور بڑھیا دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا جس کو سن کر وہ سب آگے بڑھ گئے اور ہم کو کچھ تکلیف نہ دی۔

جب وہ چلے گئے تو ہم آگے بڑھے اور شام تک چلتے رہے۔ رات کو ایک گاؤں کے پاس قیام کیا۔ وہاں آدمی رات کو چور بیل کھول کر لے گئے۔ گاڑی بان بھی کہیں غائب ہو گیا۔ صبح کو میں بہت فکر مند ہوا اور گاؤں سے جا کر کرائے کی گاڑی مانگی۔ یہ جاٹ تھے۔ ان کا چودھری میرے ساتھ آیا اور بولا ''گاڑی تو ہمارے گاؤں میں نہیں ہے۔ تم اپنی ماں کو ہمارے گھر میں ٹھہرادو۔ دوسرے گاؤں سے گاڑی منگوا دیں گے۔'' میں نے اس کو غنیمت سمجھا اور والدہ کو لے کر چودھری کے گھر میں چلا گیا۔ ہمارے پاس ایک پٹاری تھی اور ایک صندوقچہ اور ان دونوں میں اشرفیاں اور جڑاؤ زیور تھا۔

چودھری نے گھر میں اتار کر اور سب سامان رکھ کر ایک آدمی کو دوسرے گاؤں سے گاڑی لانے کے لیے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں گاؤں والوں نے غل مچایا کہ انگریزی فوج آتی ہے۔ چودھری میرے پاس آیا اور کہا جاؤ تم گھر سے بھاگ جاؤ ورنہ ہم بھی تمہارے ساتھ مارے جائیں گے۔ میں بہت گھبرایا اور چودھری سے کہنے لگا کہ اندھی ماں کو لے کر کہاں جاؤں۔ تم کو میرے حال پر ترس نہیں آتا۔ یہ سن کر اس جاٹ نے میرے ایک مکا مارا اور کہا ''کیا ہم تیرے لیے اپنی گردن کٹوا دیں۔'' میں نے بھی اس کے تھپڑ رسید کیا۔ یہ دیکھتے ہی جاٹ جمع ہو گئے اور ان سب نے مل کر مجھ کو خوب مارا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش میں آیا تو ایک جنگل میں پڑا تھا اور والدہ میرے سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔

والدہ نے کہا وہ جاٹ تجھ کو اور مجھ کو ایک چارپائی پر اٹھا کر یہاں ڈال گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اسباب لوٹنے کا بہانہ کیا تھا۔ فوج ووج کچھ نہ آئی تھی۔

وہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ جنگل بیابان، دھوپ کی شدت، ایک میں اور میری ناتواں آنکھوں سے محتاج ماں، چاروں طرف سناٹا اور دشمنوں کا ڈر، راستہ کی بے خبری اور زخموں کی دکھن سونے پر سہاگہ۔ والدہ نے کہا ''بیٹا! چلو ہمت کر کے آگے بڑھو۔ یہاں جنگل میں پڑے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ سر میں اور بازو پر زخم تھے۔ پیروں پر بھی چوٹ آئی تھی، مگر اندھی ماں کا ہاتھ پکڑ کے راستہ چلنا شروع کیا۔ کانٹے دار جھاڑیاں سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھیں، جنہوں نے بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور پیروں کو لہولہان کر دیا۔ والدہ ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑتی تھیں اور میں ان کو سنبھالتا تھا، مگر زخموں کی کمزوری سے مجھ میں بھی چلنے کی ہمت نہ تھی۔ دو وقت سے ہم نے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔ غرض ایسا وقت تھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

جب دوپہر کا سورج سر پر آیا تو میرے سر کے زخم میں ایسی تکلیف ہوئی کہ میں چکرا کر گر پڑا۔ ہوش تھا مگر اٹھنے اور چلنے کی طاقت نہ تھی۔ والدہ نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور یہ دعا مانگنی شروع کی:

''الٰہی مجھ پر رحم کر۔ میرے گناہوں کو معاف کر دے اور میری بچہ کی جان کو بچا لے۔ خدایا! یہ اندھی شہزادی تیرے آگے ہاتھ پھیلاتی ہے۔ اس کو محروم نہ کر۔ ہمارا تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔ آسمان زمین ہمارے دشمن ہیں۔ تجھ بن کس سے کہوں۔ تو جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ کل ہم ملکوں اور ہاتھی گھوڑوں اور لونڈی غلاموں کے مالک تھے۔ آج ان میں سے کچھ بھی ہمارے پاس نہیں۔ کس برتے پر دنیا والے اس فانی جہان میں جینے کی آرزو کرتے ہیں۔ توبہ ہے۔ گناہوں کی توبہ ہے۔ رحم۔ رحم۔ اے خدا رحم۔''

اماں دعا مانگ رہی تھیں کہ ایک گنوار ادھر آ نکلا اور اس نے کہا ''بڑھیا تیرے پاس جو کچھ ہو ڈال دے۔'' والدہ بولیں ''بیٹا! میرے پاس تو سوائے اس زخمی بیمار کے کچھ بھی نہیں ہے۔'' یہ سن کر اس گنوار نے ایک لٹھ والدہ کے سر پر مارا۔ لٹھ کے پڑتے ہی والدہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور انہوں نے کہا ''ہائے ظالم میرے بچہ کو نہ مار یو۔'' میں ہمت کر کے اٹھا مگر پھر چکرا کر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ گنوار نے میرے اور والدہ کے کپڑے اتار لیے۔ مجھے ہوش آیا تو گنوار چلا گیا تھا اور ہم دونوں بالکل برہنہ پڑے تھے۔ والدہ دم توڑ رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا ''اماں کیا حال ہے؟'' انہوں نے بہت اکھڑی آواز میں کہا۔ ''میاں مرتی ہوں۔ میاں کو خدا کے سپرد۔ آہ کفن بھی میسر نہ آیا۔ ارے گور بھی نہ ملے گی۔ میں شہنشاہ ہند کی بھاوج ہوں۔'' لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا اور مر گئیں۔

میں نے وہیں سے ریتا سمیٹا اور اس بیکس لاش کو خاک میں چھپا دیا اور خود بھی بمشکل گھسٹ گھسٹ کر ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک فوجی سوار وہاں سے گذرا اور مجھ کو دیکھ کر قریب آیا۔ میں نے سارا حال اس سے کہا۔ اس نے رحم کیا اور کمر کا رومال کھول کر مجھ کو دیا' جس سے میں نے تہ بند باندھا۔ اس کے بعد اس سوار نے مجھ کو اٹھا کر گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا اور اپنی چھاؤنی میں لے گیا۔ وہاں اس نے میرا علاج کرایا' جس سے میرے زخم اچھے ہو گئے۔ پھر میں اس کی خدمت کرنے لگا۔ یہ مسلمان سوار بہت ہی نیک مزاج تھا۔ اس کا مکان پٹیالہ میں تھا۔ اس کے ہمراہ کچھ دن تو میں پٹیالہ میں رہا اور پھر فقیر ہو کر شہر بہ شہر پھرنے لگا۔ جب کبھی پیسہ ہوا تو خیراتی قافلہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلا گیا اور وہاں دس برس گذارے۔ پھر مدینہ شریف حاضری دی اور وہاں بھی پانچ برس بسر کئے۔ اس کے بعد شام اور بیت المقدس کی زیارتیں کر کے حلب ہو کر بغداد شریف گیا۔ دو سال وہاں کاٹے۔ بغداد سے ایک میمن کے ہمراہ کراچی آیا اور وہاں سے دلی آ گیا' کیونکہ دلی کی یاد مجھ کو ہر جگہ بے چین رکھتی تھی۔

یہاں ریل پر میں نے مزدوری کرنی شروع کی' جس سے مجھ کو کھانے پینے کے بعد کچھ بچت ہونے لگی اور دو سال میں میرے پاس تین سو روپے ہو گئے تو میں نے ایک ٹھیلہ والے کی شرکت میں ٹھیلہ بنایا اور اس کی آمدنی سے آہستہ آہستہ ساجھی کا حصہ ادا کر کے اپنا مستقل ذاتی ٹھیلہ بنا لیا۔ اور اب اسی پر میری گذر اوقات ہے۔

سائل نے کہا ''بہرا پن کب ہوا؟ اور اس سے تو آپ کو تنہائی میں بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہوگی۔'' شہزادہ نے ہنس کر جواب دیا ''خدا کا شکر ہے کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔ سارے جہان کے عیب سننے سے کان بند ہیں۔ گاؤں میں جب

جانوں نے مارا تھا' اسی وقت دماغ پر ایسی چوٹ آئی تھی جس سے کان کی قوت جاتی رہی۔ اب صرف بائیں کان سے کچھ سن سکتا ہوں۔ دایاں بالکل بے کار ہے۔"

سائل نے یہ ماجرائے عبرت سن کر کہا "کیا میں اس کو اپنی کتاب میں لکھ دوں؟" شہزادہ نے کہا "ضرور لکھ دو' مگر یہ بھی لکھ دینا کہ ہر گذرنے والی بات اور گذرنے والا وقت اور گذرنے والی راحت و تکلیف جھوٹی اور بے اصل ہے' مگر اس میں عبرت ضرور ہے۔"

☆ ☆ ☆

فقیر شہزادہ کی دولت

عطر اور دو انڈے

تم ہیرے کو چاہو۔ موتی پر جان دو۔ سونے چاندی کو سرمایہ زندگی سمجھو۔ شال دوشالے۔ زربفت کم خواب سے جی لگاؤ۔ ہاتھی گھوڑے' پالکی نالکی' محل حویلی کو ضروری خیال کرو۔ تم کو مبارک' مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان مٹنے والی چیزوں کو دو کوڑی کا سمجھتے ہیں اور آخرت کی نعمتوں کے آگے دنیا کی ان بہاروں کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

خدا اپنی محبت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس میں امیر غریب' بڑے چھوٹے' کمین شریف کی قید نہیں ہے۔

دلی کا قلعہ آباد تھا۔ تیموری بادشاہ زندہ تھے۔ اس وقت کا ذکر ہے بہادر شاہ بادشاہ کے عزیزوں میں ایک شہزادہ کو اللہ اللہ کرنے کی لگن لگ گئی۔ گھر میں خدا نے لونڈی غلام' نوکر چاکر' ہاتھی گھوڑے سب کچھ دیا تھا' مگر یہ اللہ کا بندہ سب سے الگ مکان کے ایک کونہ میں پڑا رہتا۔ دو جو کی روٹیاں اس وقت' دو اُس وقت کھاتا' مٹی کے آبخورہ میں پانی پیتا اور یاد حق میں مصروف ہو جاتا۔

البتہ صاف کپڑے اور عطر کا بہت شوق تھا۔ ایک صندوقچہ میں طرح طرح کے عطر بھرے رکھے رہتے تھے جن سے ہر نماز کے وقت ایک نئے عطر سے کپڑے بساتے اور خدا کے سامنے معطر ہو کر ہاتھ باندھتے۔

دنیا میں ان کو اولاد سے' مال سے' کنبہ سے' رشتہ سے محبت نہ تھی۔ بس دو چیزوں پر جان دیتے تھے۔ ایک عطر اور ایک سبز دار مرغی کا جوڑا۔

عبادت سے فارغ ہوتے تو باہر آ کر سبز دار مرغی کے جوڑے کو دانہ پانی دیتے۔ اس کو دیکھ کر کبھی ہنستے کبھی روتے۔ شاید ان کو خدا کی قدرتیں یاد آتی ہوں گے اور وہ ان مرغیوں میں کوئی جلوۂ الٰہی مشاہدہ کرتے ہوں گے۔

غدر کی بھاگڑ

جب ۵۷ کا غدر پڑا اور سب دلی والے شہر سے نکلے' بادشاہ اور ان کی بیگمات و شہزادوں نے بھی قلعہ چھوڑا' تو یہ فقیر شہزادہ بھی مصلیٰ بغل میں دبا کر کھڑے ہو گئے۔ نوکروں نے عرض کی "جواہرات اور اشرفیاں ساتھ لے لیں۔" بولے

"یہ سب کچھ تم کو بخشا۔ ہم کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا نام کافی ہے۔" یہ کہا اور اپنا عطر کا صندوقچہ اور سبز دار مرغیوں کے دو انڈے لے کر چل کھڑے ہوئے۔

لوگوں نے سمجھایا" صاحب عالم یہ کیا غضب کرتے ہو۔ کھانے پینے کا سہارا ساتھ لینا چاہئے۔ یہ عطر اور انڈے کس کام آئیں گے۔ روپیہ پیسہ لو۔ جس سے گذر اوقات ہو" مگر انہوں نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ ان کے ایک چھوٹی لڑکی اور ایک بیوی تھیں۔ ان کو نوکروں کے سپرد کیا اور کہا" ان کے ساتھ رہو۔ جہاں یہ چاہیں ان کو ساتھ لے جاؤ۔ گھر میں جو کچھ نقدی ہے لے لو۔ خواہ تم رکھو۔ خواہ ان عورتوں پر خرچ کرو۔ مجھے نہ بیوی کا ساتھ دینا ہے نہ لڑکی کا اور نہ روپے پیسے کا۔"

بیگم اور بیگم زادی کی بپتا

فقیر شہزادے عطر اور انڈے لے کر سیدھے درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں آ گئے اور درگاہ کے باہر ایک کھنڈر مکان میں بیٹھ گئے۔ ایک دیسی مرغی کا جوڑا خریدا اور وہ دونوں انڈے ان کے نیچے بٹھا دیئے اور یاد حق شروع کر دی۔ کوئی روٹی دے گیا تو کھا لی۔ ورنہ بھوکے پڑ رہے۔ ہاں نماز پڑھتے تو عطر لگا کر پڑھتے کیونکہ ان کے صندوقچے میں عطر بہت تھا۔

نوکر بیگم اور بیگم زادی یعنی ان کی بیوی اور لڑکی کو لے کر گوڑگانوہ چلے گئے اور اس کے پاس سُہنہ قصبہ میں ایک مکان لے کے رہنے لگے۔

چند دن تو ان نوکروں نے ان بیکس عورتوں کی خدمت کی، لیکن چونکہ روپیہ پیسہ سب نوکروں کے ہاتھ تھا۔ ان کو طمع دامنگیر ہوئی اور ایک دن عورتوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے اور نقدی ساتھ لے گئے۔

بچاری شہزادی جو سویرے اٹھیں اور نوکروں کو آواز دی تو کوئی نہ بولا۔ باہر جھانک کر دیکھا تو میدان صاف پایا۔ بہت روئیں۔ ہراساں ہوئیں۔ اب نہ کوئی آٹا لانے والا تھا نہ پانی بھرنے والا اور نہ کچھ پاس تھا جس کو خرچ کر کے کچھ منگاتیں۔

لڑکی کی عمر چھ برس کی تھی اور وہ معصوم جانتی نہ تھی کہ اس پر اور اس کے خاندان پر کیا بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ چارپائی سے اٹھتے ہی سب سے پہلے حلوہ مانگتی تھی اور بیگم سویرے سے تیار رکھتی تھیں۔ آج نوکر نہ تھے۔ سودا کون لاتا اور حلوہ کہاں سے پکتا۔ لڑکی نے رونا شروع کیا۔ وہ مچلنے لگی اور اپنی غریب ماں کی پریشانی کو دوگنا کر دیا۔

مایوس بیگم نے پڑوسی کے ایک سقہ کو آواز دی اور اپنے ہاتھ کے طلائی کڑے دے کر کہا۔ ان کو فروخت کر کے کھانے کا سامان لا دو۔

سونے کے کڑے دیکھ کر سقہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ چپکے سے لے گئے اور دو چار روپے کا آٹا گھی شکر وغیرہ لا دی۔ بیگم نے باقی روپے مانگے تو بولا" جس بنیہ کے ہاتھ کڑے بیچے ہیں۔ اس نے باقی دام ابھی دیئے نہیں۔" بیگم خاموش ہو گئی۔

رات کو سقہ نے بیگم کے گھر میں آ کر جبکہ وہ سوتی تھیں، سارا اسباب کپڑے لتے سمیٹ لیے اور چل دیا۔ صبح کو بیگم اٹھیں تو بہت روئیں۔ محلے والوں کو پکارا۔ معلوم ہوا سقہ پڑوس سے کہیں چلا گیا۔ یہ کام اسی کا ہو گا۔ اس وقت انہوں نے

کڑوں کا حال بھی بیان کیا۔ ایک گھوسی کی عورت نے ترس کھا کر کہا۔ "بیوی اب میں تیرے پاس رہا کروں گی۔ تو گھبرا مت۔"

بیگم کے پاس ان کڑوں کے سوا اور کچھ زیور نہ تھا۔ چند دن تو رکھے ہوئے آٹے سے گذارا ہوا۔ اس کے بعد گھوسن نے اپنے پاس سے کھلایا۔

ایک دن گھوسن کے لڑکے نے ننھی بیگم کو دھکا دے دیا' جس سے ننھی کی بھوں پھٹ گئی اور بہت خون بہا۔ بیگم کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اس نے گھوسن زادہ کو برا بھلا کہا۔ اس پر گھوسن بگڑی اور کہا ہمارے احسان کو بھول گئی۔ ہمارے ٹکڑے کھاتی ہو اور ہمیں کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ بیگم سے یہ طعنہ نہ سنا گیا۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا' "اری تو مجھ کو کیا روٹی کھلائے گی۔ میں اس باپ کی بیٹی ہوں' جو سارے ہندوستان کے رئیسوں نوابوں کو روٹی کھلاتا تھا' جس کے دروازہ پر ہاتھی جھولتے تھے۔ جو ہر بیکس کا والی اور پشت پناہ تھا۔ آج اگر میں تباہ ہو گئی تو کیا میری شرافت بھی جاتی رہی۔ میں تیرے طعنے نہ سنوں گی اور آج سے تیری روٹی نہیں کھاؤں گی۔ تیرے بچے میری لاچار بچی کو لہولہان کریں اور میں چپکی بیٹھی دیکھوں۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ تو نے جے دن روٹی کھلائی ہے۔ میں اس کا بدل کر دوں گی اور جب خدا میرے دن پھیرے گا' تیرے احسان کا بوجھ اتار دوں گی۔

خواب کا سانپ

اس دن غم سے بیگم نے کچھ نہ کھایا اور بچی زخم کی تکلیف میں پڑی رہی۔ اس نے بھی کھانے کو کچھ نہ مانگا۔ رات کو بیگم نے خواب دیکھا کہ مجھ کو ایک سانپ نے نگل لیا اور اس کے اندر ایک باغ لگا ہوا ہے۔ باغ میں ایک تخت پر اس کے شوہر فقیر شہزادے بیٹھے ہیں اور ان کی لڑکی اپنے سر کا زخم ان کو دکھاتی ہے اور کہتی ہے کہ دیکھو ابا! گھوسن کے لڑکے نے میرا سر پھوڑ ڈالا۔

اس پر فقیر شہزادے نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دو فرشتے آسمان سے اترے اور انہوں نے ایک سانپ لڑکی کے گلے میں ڈال دیا۔ بیگم یہ دیکھ کر ڈریں اور چیخیں۔ ہے ہے میری بچی۔ یہ کہتے ہی آنکھ کھل گئی تو سنا دروازہ پر کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ انہوں نے کہا "کون ہے۔" آواز آئی "تمہارا خاوند۔"

بیگم حیران ہو گئی۔ آواز واقعی فقیر شہزادے کی تھی۔ کنڈی کھول دی۔ وہ اندر آئے اور کہا "چلو گاڑی تیار ہے۔"

بیگم نے کہا "کہاں چلوں اور تم کہاں سے آ گئے۔" اس کا انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکی کو گود میں اٹھایا اور بیگم کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ ان کے ہمراہ ہو گئیں۔ باہر گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں سوار کر کے درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں آ گئے۔

جب یہاں پہنچے تو ایک مکان میں بیگم اور لڑکی کو اتارا اور خود باہر چلے گئے۔ بیگم نے دیکھا مکان میں ضرورت کی سب چیزیں مہیا ہیں اور ایک صندوقچہ کھلا رکھا ہے۔ اس کو جو دیکھا تو دو ہزار روپے کی اشرفیاں اس میں تھیں۔

بیگم کو بہت تعجب تھا کہ فقیر شہزادے کس طرح یہاں پہنچے اور یہ سب سامان کہاں سے آ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک

شخص نے آواز دی کہ تمہارے شوہر کا جنازہ تیار ہے۔ لڑکی کو صورت دکھا دو تا کہ اس کے بعد ہم ان کو دفن کریں۔ مجھے اور خلجان ہوا کہ ابھی ان کو گھر سے گئے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ مر کب گئے۔

بیگم نے پکارنے والے سے کہا "تم کون ہو اور میرے شوہر کب مر گئے۔" اس نے کہا "اس کا حال مجھے معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ فقیر شہزادہ صاحب کی یہ وصیت تھی کہ میں ان کی میت ان کی لڑکی کو دکھاؤں۔" بیگم نے لڑکی کو ساتھ لیا اور خود کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر میں لڑکی واپس آئی اور کہا "ابا جانی مر گئے۔ ان کو قبر میں گاڑ دیا۔" لڑکی کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ شخص پھر آیا اور آواز دی اور کہا سُہنہ والی گھوسن کو انعام دے دیا گیا۔ اب اس کا تم پر کوئی احسان باقی نہیں۔ تم کو جب تک یہ بچی جوان ہو چالیس روپے ماہوار خرچ کے لیے ملیں گے۔ اس کے بعد تم مر جاؤ گی اور یہ لڑکی اپنے خاوند کے ہاں چلی جائے گی۔"

بیگم کو یہ عجیب باتیں برداشت نہ ہوئیں۔ وہ غش کھا کر گر پڑیں اور جب ہوش آیا تو ایک ماما کو بیٹھا پایا جس نے کہا "تم میرے ساتھ الور چلو۔ میاں نے وہاں تمہارے لیے گھر لیا ہے۔ الور جا کر میں سارا حال بیان کروں گی۔" چنانچہ بیگم ماما کے ساتھ الور چلی گئیں اور ایک اچھے گھر میں ان کو اتارا۔ اس وقت ماما نے کہا "فقیر شہزادہ صاحب کا ایک روحانی مؤکل تابع تھا۔ جس دن تمہاری لڑکی کے چوٹ لگی۔ اسی دن تمہارے شوہر نے انتقال کیا۔ یہ سارا سامان جو تم نے دیکھا اسی مؤکل کا ہے اور لو دیکھو کہ میں وہی مؤکل ہوں۔ تم آرام سے یہاں رہو۔ میں تمہاری خدمت کروں گا اور جب لڑکی کی شادی ہو جائے گی تو میرا کام ختم ہو جائے گا۔"

لڑکی کو میں نے ہی اس کے باپ کی میت قبر کے اندر مرحوم کی وصیت کے مطابق دکھائی تھی۔ یہ کہہ کر ماما غائب ہو گئی اور بیگم کو لڑکی کی شادی تک غیبی آدمی خرچ پہنچاتا رہا۔ لڑکی کی شادی کے بعد بیگم مر گئیں اور غیبی مؤکل کا کام ختم ہوا۔

☆ ☆ ☆

دکھیا شہزادی کی کہانی
(ننھی شہزادی کے دو ہاتھ لیڈی ہارڈنگ کی تصویر پر)

اماں! یہ صورت انہی وایسرانی کی ہے جنہوں نے ہم کو ایک ہزار روپے دیے ہیں۔ ہاں بچی! یہ بڑے لاٹ صاحب کی بیوی کا فوٹو ہے۔ بڑی رحم دل ہیں۔ ہمیشہ غریبوں پر ترس کھایا کرتی ہیں۔ اب کے ہم بے سہاروں کا بھی خیال آ گیا۔

ذرا اس تصویر کو مجھے دینا۔ میں ان بیگم کی بلائیں لوں۔ واری جاؤں اور باتیں کر کے جی کی بھڑاس نکال لوں۔

بھولپن کی باتیں

میں صدقے تم بڑی اچھی آدمی ہو۔ میں قربان۔ کیا نورانی صورت ہے' مگر تم ہم غریبوں کے جھونپڑے میں کیونکر آ گئیں؟ ہمارے ہاں تو ٹوٹے بوریے کا فرش بھی پورا نہیں ہے۔ میں تم کو کہاں بٹھاؤں۔ ہم کو چارپائی بھی میسر نہیں۔ ہم سب زمین پر سوتے ہیں۔ یہ بہت ٹھنڈی ہے۔ تم کو نزلہ نہ ہو جائے۔ ہمارے مکان کی کڑیاں بھی جھکی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو گر پڑیں۔ میں تمہاری کیا خاطر کروں۔ کیا چیز دسترخوان پر چنوں۔ پرسوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ ابا میاں کو بنیے نے آٹا قرض نہیں دیا۔ اس وقت بھوک کے مارے میری عجیب حالت ہے۔ اگر گھر میں کچھ ہوتا تو میں سب تمہارے سامنے رکھ دیتی۔ میں بھوکی رہتی تم کو کھلاتی' کیونکہ تم نے ہم پر احسان کیا ہے اور اس وقت ہم کو یاد کیا ہے جب کہ سارا جہان ہم کو بھول گیا تھا۔

کیوں بیگم! تمہارا جی اس اندھیرے گھر میں گھبراتا تو نہیں؟ تم تو بجلی کی روشنیوں میں رہتی ہو۔ میں کیا کروں۔ آج ہم کو مٹی کا چراغ بھی نصیب نہیں ورنہ اسی کو روشن کر دیتی۔

تم کو کہاں سلاؤں؟ رات کیوں کر گذرے گی؟ ہمارے پاس فقط دو پھٹے ہوئے کمبل ہیں۔ ایک ابا میاں اوڑھتے ہیں اور ایک میں۔ اماں مجھ کو ساتھ لے کر سوتی ہیں۔

میرے پیارے لاٹ صاحب کی بیگم! اچھی ذرا میرے ہاتھوں اور منہ کو دیکھو۔ سردی سے پھٹ گئے ہیں۔ سردی کی راتیں پہاڑ ہو جاتی ہیں۔ سکھ کی نیند ہمارے خواب میں نہیں آتی۔

تم نے ہم کو ہزار روپے دیے ہیں۔ میں ہزار ہا اپنے ہاتھوں سے تمہاری چٹ چٹ بلائیں لوں۔ اماں کہتی ہیں ایک زمانہ ہمارا بھی تھا۔ ہم بھی ہزاروں روپے غریبوں محتاجوں کو بانٹا کرتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی اونی قالین اور مخملی فرش تھے۔ ریشمی زرین پردے تھے۔ سونے چاندی کی جڑاؤ چھتیں تھیں۔ شال دوشالے تھے۔ لونڈی غلام تھے۔ محل تھے۔ ہندوستان کی شہنشاہی میں داخل تھے۔

ہمارے سامنے بھی گردنیں جھکتی تھیں۔ راجہ مہاراجہ اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ ہم بھی لاچار اور بے سہاروں پر ترس کھاتے تھے۔ دوسروں کی خاطر اپنا گھر لٹاتے تھے۔ ہمارے جلوس میں بھی نقارے بجتے تھے۔ نقیب کڑکتے تھے۔ ہاتھی جھوم جھوم کر چلتے تھے۔ ہمارے سر پر بھی تاج تھا۔ تلواریں ہمارے قدموں پر سر ٹیک کر چلتی تھیں۔ توپیں ہماری ہُوں پر بھی گرج گرج کر بستی تھیں۔

لیکن بیگم اب وہ وقت کہاں ہے۔ دنیا ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے

اونچے اونچے مکان تھے جن کے بڑے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — استخوان تک بھی ان کے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

خدا نے ہم کو نعمت دی۔ جب تک اس کے قابل رہے' نعمت پاس رہی اور جب ہمارے عمل خراب ہوئے' عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ ملک سے بے خبر ہو گئے۔ مظلوموں کو بھول گئے۔ ظالموں کی چرب زبانیوں پر پھول گئے۔ خدا نے وہ دولت چھین لی اور دوسروں کو دے دی۔ ہم کو اس میں کسی سے شکوہ نہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ہاں تم میری ماں کے برابر بلکہ ان سے بھی بڑی ہو۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ یہاں بھی نہ بولوں تو کہاں زبان کھولوں۔ خدا نے تم کو ہم سب کا رکھوالا بنایا ہے۔ دیکھو تو بھوک پیاس ہم کو ستاتی ہے۔ ہمارے البیلے دن خاک میں ملاتی ہے۔ میری عمر ایسی تھی کہ چہرہ لال ہوتا' مگر فاقوں نے زرد کر دیا ہے۔ ہمارے گھر میں عید بقر عید کی خوشی بھی نہیں آتی۔ ہم کو ان دنوں میں بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ہم اس دن بھی ٹوٹی ہوئی جوتیاں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس دن ساری دنیا اپنی اپنی حیثیت کے بموجب نئی جوتیاں اور نئے کپڑے پہنتی ہے۔ ہم کو برسات کے ٹپکے کے کھٹکے رات دن رلاتے ہیں۔ ہم کو سردیاں جلانے آتی ہیں۔ ہم پر گرمیاں قیامت ڈھاتی ہیں۔

دلی شہر کے کتے پیٹ بھر کر سوتے ہیں۔ کوے شکم سیر ہو کر گھونسلوں میں جاتے ہیں۔ چڑیوں تک کے واسطے پکی چھتوں کے گھر ہیں۔ گلہریاں بھی شاندار مکانوں میں رہتی ہیں' مگر تیمور بادشاہ کی اولاد شاہجہاں بادشاہ کے بچے' جنہوں نے اس شہر کو فتح کیا اور بنایا' آدھی روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہوئے بھوکے سوتے ہیں۔ ان کو کوئی رات بے فکری کی نصیب نہیں ہوتی۔ جن کے باپ دادا نے لال قلعہ بنایا تھا' ان کو ٹوٹا جھونپڑا بھی میسر نہیں آتا۔

بھکارن شہزادی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر

بیگم تم نے دیکھا ہوگا۔ دلی شہر میں ایک جامع مسجد ہے' جس کو ہمارے دادا شاہجہاں نے بنایا تھا۔ دور دور کی خلقت اس کو دیکھنے آتی ہے' مگر اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے پھٹے ہوئے برقعہ کے اندر ناتواں بچہ کو گود میں لیے پیوند لگا پاجامہ اور گھسی ہوئی کنے لگی جوتی پہنے کون عورت بھیک مانگتی ہے۔ بیگم! یہ غریب دکھیا یہ وہ شہزادی ہے۔ جس کا کوئی وارث نہیں رہا۔ تم یقین کرنا کہ میری رحم دل وایسرانی! اسی کے باپ شاہجہاں نے یہ مسجد بنوائی تھی۔ آج پیٹ کے لیے بھیک کے ٹکڑے جمع کر رہی ہے' تاکہ زندگی کی مسجد آباد کرے۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میں تم سے کیونکر کہوں کہ یہ ہزار روپے بہت تھوڑے ہیں۔ مرہم کے ایک چھوٹے سے پھاہے سے کیا ہوگا۔ ہمارے تو سارے بدن پر زخم ہیں۔

تمہاری نئی دلی کی خیر جس کی سڑکوں میں لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ تمہاری نئی عمارتوں کی خیر جن کے واسطے کروڑوں روپے کی منظوری ہے۔ تمہارے اس نیک خیال کی خیر جس کی بدولت دلی کی پرانی عمارتوں کی مرمت ہو رہی ہے اور بے شمار روپیہ اس میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے پیٹ کی نامراد سڑکوں کی بھی مرمت کرا دو اور ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں پر بھی عمارتیں چنواؤ۔ ہم بھی پرانے زمانہ کی نشانیاں ہیں۔ ہم کو بھی زندہ آثار قدیم میں لوگ سمجھتے ہیں۔ ہم کو بھی سہارا دو۔ مٹنے سے بچاؤ۔ خدا تم کو سہارا دے گا اور بچائے گا۔

یہ کہتے کہتے دکھیا شہزادی چونکی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا اور کہا میں بھی کیا دیوانی ہوں۔ تصویر سے باتیں کرتی ہوں۔ کاغذی بت کے آگے مرادیں مانگتی ہوں' مگر شاید کسی خدا کے بندے کے کان تک یہ دعا

پن کی باتیں پہنچ جائیں اور وہ انگریزی میں ترجمہ کر کے خدا ترس ہارڈنگ بیگم کو یہ سنا دے اور وہ اپنے خاوند لاٹ صاحب سے کہیں' کونسل کے ممبروں سے کہیں' بادشاہ سلامت اور ان کی ملکہ سے کہیں کہ آل شاہجہاں کی حفاظت کے لیے نئی دتی کی دیگر منظوریوں کے ساتھ کوئی شاندار اور مصیبت شکن منظوری ہونی چاہیے۔[1]

☆ ☆ ☆

ا۔ لیڈی ہارڈنگ مرحومہ نے اس تحریر پر توجہ کر کے غریب شہزادوں کی مدد فرمادی تھی۔ (حسن نظامی)

دُکھیا شہزادی کی کہانی

جس نھی شہزادی کا یہ خالی قصہ لکھا گیا ہے' اس کی ماں پر غدر کے زمانہ میں بڑی بپتا پڑی تھی' اس لیے وہ سچا اور اصلی قصہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

غدر میں میری عمر سات برس کی تھی۔ اماں مجھ کو تین برس کا چھوڑ کر مر گئی تھیں۔ ابا کے پاس رہتی تھی۔ چودہ برس کا میرا ایک بھائی جمشید شاہ نامی تھا' مگر ہاتھ پاؤں کے اٹھان سے بیس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ ابا جان نابینا ہو گئے تھے اور ہمیشہ گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ڈیوڑھی پر چار نوکر اور ایک داروغہ۔ گھر میں تین باندیاں اور ایک مغلانی کام کرتی تھیں۔ حضرت بہادر شاہ ہمارے رشتہ کے دادا ہوتے تھے اور ہمارا سب خرچ شاہی خزانہ سے ملتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بکری پلی ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے اس کے بچہ کو ستانا شروع کیا۔ بکری نے بگڑ کر میرے ٹکر ماردی۔ میں نے غصہ میں دست پناہ گرم کر کے بکری کے بچہ کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ وہ بچہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

کچھ دن کے بعد غدر پڑا۔ بادشاہ کے نکلنے کے بعد ہم بھی ابا کے ساتھ شہر سے نکلے۔ پالکی میں سوار تھے اور جمشید بھائی گھوڑے پر ساتھ ساتھ تھے۔ دلّی دروازے سے نکلتے ہی فوج والوں نے پالکی پکڑ لی۔ بھائی کو بھی گرفتار کرنا چاہا۔ انہوں نے تلوار چلائی۔ ایک افسر کو زخمی کیا۔ آخر زخموں سے چُور چُور ہو کر گرے۔ سامنے دو نوکدار پتھر پڑے تھے۔ وہ آنکھوں میں گھپ گئے اور بھائی نے چیخیں مار مار کر تھوڑی دیر میں جان دے دی۔ بھائی کی بے قرار آواز سن کر ابا میاں بھی پالکی سے نیچے اتر آئے اور ٹٹول ٹٹول کر لاش کے پاس گئے اور پتھر سے سر ٹکرا کر لہولہان کر لیا' یہاں تک کہ ان کا وہیں خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد فوج والوں نے ہمارا سب سامان لے لیا اور مجھ کو بھی پکڑ لیا۔ چلتے وقت باپ اور بھائی کی لاش سے چمٹ کر خوب روئی اور ان کو بے گور و کفن چھوڑ کر مجبوراً فوج کے ساتھ چلی گئی۔

ایک دیسی سپاہی نے افسر سے مجھے مانگ لیا اور اپنے گھر مجھ کو لے گیا' جو پٹیالہ کی ریاست میں تھا۔

اس سپاہی کی بیوی بڑی بدمزاج تھی۔ وہ مجھ سے برتن منجھواتی۔ مصالحہ پسواتی۔ جھاڑو دلواتی اور رات کو پاؤں دبواتی تھی۔

شروع شروع میں ایک رات دن بھر کی محنت سے تھک گئی تھی۔ پاؤں دباتے میں اونگھ آئی تو اس جلادنی نے

دست پناہ گرم کر کے میری بھوؤں پر رکھ دیا جس سے پلکیں تک جھلس گئیں اور بھوؤں کی چربی نکل آئی۔ میں نے ابا کو پکارنا شروع کیا' کیونکہ مجھے اتنی سمجھ نہ تھی کہ مرنے کے بعد پھر کوئی آیا نہیں کرتا۔ جب ابا نے جواب نہ دیا تو میں اس عورت کے ڈر کے مارے سہم کر چپ ہو گئی' لیکن اس پر بھی اس کو ترس نہ آیا اور بولی کہ پاؤں دبا۔ زخموں کی تکلیف میں مجھ کو نیند نہ آتی تھی۔ اور پیر بھی نہ دب سکتے تھے' مگر قہر درویش بر جان درویش' میں نے اسی حالت میں پاؤں دبائے۔

سویرے مسالہ پیسنے میں مرچوں کا ہاتھ زخموں میں لگ گیا۔ اس وقت مجھ کو تاب نہ رہی اور زمین پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی' مگر بے رحم عورت کو تب بھی کچھ خیال نہ آیا اور بولی "چل مکار کام سے دم چراتی ہے" اور یہ کہہ کر پسی ہوئی مرچیں زخموں پر مل دیں۔ اس وقت مجھ کو مارے تکلیف کے غش آ گیا اور رات تک ہوش نہ آیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بچارا سپاہی میرے زخموں کو صاف کر کے دوا لگا رہا تھا۔

تھوڑے دن کے بعد سپاہی کی یہ بیوی مر گئی اور اس نے نئی شادی کی جو مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اسی کے گھر میں میں جوان ہوئی اور اسی نے میری شادی ایک غریب آدمی سے کر دی۔ دو برس تک میرا خاوند زندہ رہا۔ اس کے بعد مر گیا۔ بیوہ ہو کر دتی چلی آئی' کیونکہ وہ سپاہی بھی مر گیا تھا اور اس کی بیوہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ دہلی میں آ کر میں نے بھی اپنی قوم میں دوسری شادی کر لی' جس سے فقط ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

اس خاوند کے پانچ روپے ماہوار انگریزی سرکار سے پنشن تھی مگر تنخواہ قرضہ میں چلی گئی اور اب ہم نہایت عسرت اور تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

بچاری شہزادی کا خاکی چھپر کھٹ

(گل بانو کی کہانی)

گل بانو خدا رکھے پندرہ برس کی ہوئیں۔ جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا۔ مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے۔ میرزا دارا بخت بہادر سابق ولی عہد بہادر شاہ کی نور چشم ہیں۔ باپ نے بڑے چاؤ چوچلے سے پالا ہے اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ کر قبر میں گئے' محل میں گل بانو کی ناز برداریاں پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگیں۔ اماں کہتی ہیں نگوڑی کے ننھے سے دل کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔ باپ کا ہڑکا نہ کرے۔ اس کی ایسی دل داری کرو کہ ان کی محبتوں کو بھول جائے۔

اُدھر دادا یعنی بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم ہے کہ پوتی کے لاڈ میں کسی بات سے دریغ نہیں کرتے۔ نواب زینت محل ان کی لاڈلی اور منظور نظر بیوی ہیں۔ جواں بخت ان ہی کے پیٹ کا شہزادہ ہے۔ اگرچہ میرزا دارا بخت کے قبل از وقت مر جانے سے ولی عہد کا منصب میرزا فخرو کو ملا ہے' مگر جواں بخت کی محبتوں کے سامنے ولی عہدی کی بھی کچھ پرسش نہیں ہے اور زینت محل انگریزی حکام سے اندر ہی اندر جواں بخت کی تخت نشینی کے معاملات طے کر رہی ہیں۔ جواں بخت کی اس

دھوم سے شادی ہوتی ہے کہ مغلوں کی آخری تاریخ میں اس کروفر کی نظیر نہیں ملتی۔ غالبؔ و ذوقؔ سہرے لکھتے ہیں اور ان میں وہ مشہور شعر بازی کی چشمک ہو جاتی ہے جس کا ذکر شمس العلماء آزاد دہلوی نے ''آب حیات'' میں کیا ہے اور غالبؔ کو لکھنا پڑتا ہے کہ:

''مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ورنہ خدانخواستہ استاد شاہ یعنی ذوقؔ سے کچھ عداوت نہیں ہے۔''

یہ سب کچھ تھا اور جواں بخت اور زینت محل کے آگے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا' مگر گل بانو کی بات سب سے نرالی تھی۔ بہادر شاہ کو اس لڑکی سے جو تعلق تھا اور جیسی سچی محبت وہ اس یتیم لڑکی سے رکھتے تھے' ایسی کیفیت زینت محل اور جواں بخت کو بھی میسر نہ تھی۔

پس اندازہ ہو سکتا ہے کہ گل بانو کس شان و شوکت و ناز و نعمت سے زندگی بسر کرتی ہوں گی۔ ہونے کو میرزا دارا بخت کے اور بھی بال بچے تھے' مگر گل بانو اور اس کی والدہ سے ان کو عشق تھا۔ گل بانو کی ماں ایک ڈومنی تھی اور میرزا اس کو تمام بیگمات سے زیادہ چاہتے تھے۔ جب وہ مرے ہیں تو گل بانو بارہ سال کی تھی۔ میرزا درگاہ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ میں دفن ہوئے تھے جو دہلی سے چھ میل کے فاصلہ پر پرانی دہلی کے کھنڈروں میں واقع ہے۔ گل بانو مہینہ کے مہینہ ماں کو لے کر باپ کی قبر دیکھنے جایا کرتی تھیں۔ جب جاتیں قبر کو لپٹ کر روتیں اور کہتیں ''ابا! ہم کو بھی اپنے پاس لٹا کر سلا لو۔ ہمارا جی تم بن گھبراتا ہے۔''

جب گل بانو نے پندرہویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں مگر دل ربائی کی شوخیاں اس قسم کی بڑھائیں کہ محل کا بچہ بچہ پناہ مانگتا تھا۔ سونے کے چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کو چراغ جلے اور بانو چھپر کھٹ پر پہنچیں۔ ماں کہتیں چراغ میں بتی پڑی لاڈو پلنگ چڑھی' تو وہ مسکرا کر انگڑائی اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتیں ''اچھا بی! تم کو کیا۔ سوتے ہیں۔ وقت کھوتے ہیں۔ تمہارا کیا لیتے ہیں۔ تم ناحق کولوں پر لوٹی جاتی ہو۔'' ماں کہتی ''نا بنو! میں جلتی نہیں۔ شوق سے آرام کرو۔ خدا تم کو ہمیشہ سکھ نیند سلاتا رکھے۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ زیادہ سونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ تم شام کو سوتی ہو تو سویرے ذرا جلدی اٹھا کرو' مگر تمہارا تو یہ حال ہے کہ دس بج جاتے ہیں۔ گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے۔ لونڈیاں ڈر کے مارے بات تک نہیں کر سکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائے گی۔ ایسا بھی کیا سونا۔ آدمی کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہئے۔ اب ماشاء اللہ تم جوان ہوئیں۔ پرائے گھر جانا ہے۔ اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیوں کر گزارہ ہوگا۔''

گل بانو ماں کی یہ تقریر سن کر بگڑتی اور کہتی ''تم کو ان باتوں کے سوا کچھ اور بھی کہنا آتا ہے۔ ہم سے نہ بولا کرو۔ تمہیں ہم دوبھر ہو گئے ہیں تو صاف صاف کہہ دو۔ دادا حضرت (بہادر شاہ) کے پاس جا رہیں گے۔''

محبت کا مکتب

اسی زمانہ کا ذکر ہے۔ میرزا داور شکوہ شہزادہ خضر سلطان کا بیٹا گل بانو کے پاس آنے جانے لگا۔ قلعہ میں باہمی پردے کا دستور نہ تھا' یعنی شاہی خاندان کے افراد آپس میں پردہ نہ کرتے تھے۔ اس واسطے میرزا داور کی آمد و رفت بے

روک ٹوک ہوتی تھی۔

پہلے تو گل بانو ان کی بہن اور وہ ان کے بھائی تھے۔ چچا تایا کے دو بچے سمجھے جاتے تھے' لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا۔ میرزا گل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے اور گل بانو داور کو ظاہری قرابت کے سوا کسی اور رشتے کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن صبح کے وقت میرزا گل بانو کے پاس آئے تو دیکھا بانو سیاہ دوشالہ اوڑھے سنہری چھپر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے۔ اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہے۔ تکیہ الگ پڑا ہے۔ دونوں لونڈیاں مکھیاں اڑا رہی ہیں۔

داور شکوہ چچی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا' مگر کن انکھیوں سے گل بانو کا یہ عالم مخموری دیکھتا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا اور بولا۔ ''کیوں چچی حضرت بانو اتنے دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں۔ دھوپ قریب آ گئی۔ اب تو ان کو جگا دینا چاہئے۔'' چچی نے کہا' ''بیٹا! بانو کے مزاج کو جانتے ہو کس کی شامت آئی ہے جو ان کو جگائے۔ آفت برپا ہو جائے گی۔'' داور نے کہا ''دیکھئے میں جگاتا ہوں۔ دیکھوں کیا کرتی ہیں۔'' چچی ہنس کر بولیں ''جگا دو۔ تم سے کیا کہیں گی۔ تمہارا تو بہت لحاظ کرتی ہیں۔'' داور نے جا کر تلوے میں گدگدیاں کیں۔ بانو نے انگڑائی لے کر پاؤں سمیٹ لیا اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا۔ اس کو خیال تھا کہ کسی لونڈی کی شرارت ہے۔ اس کی گستاخی کی سزا دینی چاہئے' مگر جب اس نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود بخود اس کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے اس نے دوشالہ کا آنچل منہ پر ڈال لیا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ داور نے اس ہوش پاش منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار چیخ کر بولا' ''لو چچی حضرت! میں نے بانو کو اٹھا بٹھایا۔''

محبت نے بہت ترقی کی۔ مکتب عشق کی ابجد ختم ہو گئی اور درس ہجر و وصل کے شکوے پڑھے جانے لگے' تو گل بانو کی ماں کو شبہ ہوا اور اس نے داور شکوہ کا اپنے گھر میں آنا بند کر دیا۔

غدر کے نو مہینے بعد

درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک گوشے میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کا مینہ دھواں دھار برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی' جہاں اس عورت کا بستر تھا۔

یہ عورت سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد' بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی۔ بخار کی بے ہوشی میں اس نے آواز دی' ''گلبدن' اری او گلبدن! مردار کہاں مر گئی۔ جلدی آ اور مجھ کو دوشالہ اوڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے۔ پردہ چھوڑ دے۔ روشنک تو ہی آ۔ گلبدن تو کہیں غارت ہو گئی۔ میرے پاس لونگوں کی انگیٹھی لا۔ پسلی پر مل دے۔ ارے درد سے میرا سانس رکا جاتا ہے۔''

جب کوئی اس آواز پر بھی اس کے پاس نہ آیا تو اس نے کمبل چہرے سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے

دالان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مینہ سنانٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی (جو اس کے باپ کی تھی)۔

یہ حالت دیکھ کر اس عورت نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور کہا "بابا۔ بابا! میں تمہاری گل بانو ہوں۔ دیکھو اکیلی ہوں۔ دیکھو میں اکیلی ہوں۔ اٹھو مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔ آہ میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میرے پاس اس بوسیدہ کمبل کے سوا اوڑھنے کو کچھ نہیں ہے۔ میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں محلوں سے جلا وطن ہوگئی۔ بابا اپنی قبر میں مجھ کو بلالو۔ اچھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ کفن سے منہ نکالو اور مجھ کو دیکھو۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ میرا چھپر کھٹ کیا ہوا۔ میرا دوشالہ کہاں گیا۔ میری سیج کدھر گئی۔ ابا ابا اٹھو جی کب تک سوؤ گے۔ ہائے درد۔ افوہ۔ سانس کیونکر لوں۔"

یہ کہتے کہتے اس کو غفلت سی ہوگئی اور اس نے دیکھا کہ میں مرگئی ہوں اور میرے والد میرزا دارا بخت مجھ کو قبر میں اتار رہے ہیں اور رو رو کر کہتے ہیں: "یہ اس بچاری کا خاکی چھپر کھٹ ہے۔"

آنکھ کھل گئی اور بچاری بانو ایڑیاں رگڑنے لگی۔ سکرات کا وقت شروع ہوگیا اور وہ کہتی تھی "لو صاحب میں مرتی ہوں۔ کون میرے حلق میں شربت ٹپکائے گا۔ کون مجھ کو یٰسین سنائے گا۔ کس کے زانو پر میرا سر رکھا جائے گا۔ الٰہی تیرے سوا میرا کوئی نہیں۔ تو ایک ہے۔ تیرا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میرا مونس و رفیق ہے اور یہ چراغ اولیاءؒ میرے پڑوسی۔

لا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ" رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط"

شہزادی مرگئی اور دوسرے دن گور غریباں میں گڑ گئی اور وہی اس کا ابدی چھپر کھٹ تھا، جس میں قیامت تک سوتی رہے گی۔

☆ ☆ ☆

غدر کی بنا غلط فہمیاں

خانم کا بازار دہلی میں مشہور مقام تھا جس کی آبادی قلعہ کے سامنے تھی اور جس میں بڑے بڑے مشہور صناع اور مختلف حرفتوں کے کاریگر رہتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہ محلہ جڑ بنیاد سے کھد گیا اور اب وہاں میدان کے سوا کچھ بھی باقی نہیں ہے۔

اپریل ۱۸۵۷ء کا ذکر ہے۔ ایک دن شام کے وقت محمد یوسف سادہ کار لال ڈگی پر سیر کرنے گیا تو اس کو ایک ہندو جوہری کا ملازم ملا اور اس نے کہا کہ "ہمارے لالہ کو ایک مندر کا طلائی کلس بنوانا ہے اور انہوں نے تم کو اپنے مکان پر بلوایا ہے۔ چل کر کام کا تخمینہ کرلو۔"

محمد یوسف ایک مشہور چاندی والے دستکار کا لڑکا تھا۔ خاص بازار اور خانم کے بازار میں جتنے چاندی والے رہتے تھے وہ لاہوریوں کے نام سے مشہور تھے اور اب بھی ان کو لاہوری کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ چاندی کے برتن اور سونے

کے زیور بناتے تھے اور ہتھیار سازی کا پیشہ بھی اسی قوم کے ہاتھ میں تھا۔ محمد یوسف کے باپ نقرئی برتن بنانے میں استاد مانے جاتے تھے اور محمد یوسف کو ملمع سازی کا کام سکھایا تھا۔

جوہری کے نوکر نے طلائی کلس کا نام لیا تو یوسف اس کے ساتھ چلنے کو آمادہ ہوا' مگر اس نے کہا کہ مغرب کی نماز پڑھ کر چلوں گا کیونکہ وقت قریب آ گیا ہے۔ نوکر نے کہا اچھا میں ٹھہرا ہوا ہوں' تم نماز پڑھ لو۔ یوسف نے ایک مسجد میں جا کر نماز پڑھی اور باہر آ کر نوکر کے ساتھ ہو گیا۔ نوکر اس کو مالی واڑہ میں لے گیا' جہاں ہندو جوہری آباد تھے اور یوسف اکثر اس محلہ میں کام لینے دینے جایا کرتا تھا۔

ایک گلی میں جا کر نوکر نے کہا'' تم ذرا یہاں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔'' یوسف کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں چار آدمی ایک گھر میں سے نکل کر آئے۔ یہ بہت لمبے تڑنگے اور موٹے تازے جوان تھے۔ ان چاروں کے ساتھ وہ نوکر بھی تھا جو یوسف کو بلا کر لایا تھا۔ ان جوانوں نے یوسف سے کہا'' آیئے اس مکان میں چلیے تاکہ ہم آپ کو کام دکھائیں۔'' یوسف کو پہلے تو شک ہوا کہ یہ جوہری نہیں ہیں۔ خبر نہیں کیا بھید ہے' مگر پھر اس نے دل کو مضبوط کر کے خیال کیا کہ جو بھی ہوں مجھے ڈرنا نہ چاہیے اور وہ سیدھا ان کے مکان میں چلا گیا۔ وہاں ایک مولوی صاحب بیٹھے تھے جنہوں نے یوسف کو دیکھتے ہی السلام علیکم کی صدا بلند کی۔ یوسف کو اور بھی تعجب ہوا اور وہ وعلیکم السلام کہہ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا'' میاں صاحبزادے! تم کو ہم نے ایک حیلہ سے بلایا ہے۔ مندر کا کلس بنوانا مقصود نہیں ہے بلکہ کچھ اور کام ہے۔ میں اس شہر کا باشندہ نہیں ہوں اور یہ چاروں آدمی بھی پردیسی ہیں اور ہم سب ایک ہندو جوہری کے مہمان ہیں جس نے ہم کو تمہارا پتہ بتایا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے چچا ہتھیار سازی کا فن جانتے ہیں اور دہلی کے میگزین میں ان کی آمد و رفت ہے اور وہاں کا سب حال ان کو معلوم ہے۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ انہی کو بلائیں مگر معلوم ہوا کہ وہ ڈرپوک آدمی ہیں۔ اس واسطے ہم نے تم کو بلانا مناسب سمجھا' کیونکہ تم بڑے ہمت والے ہو۔ جوہری صاحب کے لڑکے سے آٹھ دن پہلے جو باتیں تم نے کی تھیں' ان سے معلوم ہوا کہ تمہارے دل میں اپنے دین کی محبت ہے اور بے دین فرنگیوں کی حکومت سے تم خوش نہیں ہو۔ اس واسطے میں یہ قرآن شریف تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ ہمارا بھید کسی سے نہ کہو گے اور جو کام تم سے کہا جائے اس کو پورا کرو گے۔''

یوسف نے کہا'' میں قسم کھانے سے ڈرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی قسم ہے۔ اس سے معاف کیجئے۔ البتہ اس کا عہد کرتا ہوں کہ آپ کا کام دینی ہو گا تو جان و مال سے اس کی مدد کروں گا۔''

یہ جواب سن کر ان چاروں آدمیوں نے تلواریں سونت لیں اور کہا کہ'' قسم نہ کھاؤ گے تو جان کی خیر نہیں۔ ہم ابھی ذبح کر ڈالیں گے۔'' مولوی صاحب نے ان چاروں کو خفگی کے لہجہ میں اس حرکت سے روکا اور یوسف کو نرمی سے سمجھانے لگے۔

یوسف کچھ تو ڈرا اور کچھ مولوی صاحب کی باتوں کا اثر ہوا اور فوراً قرآن شریف کو اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور بولا۔ '' میں ہر دینی کام کے لیے جو آپ بتائیں حاضر ہوں' خواہ میری جان جاتی رہے۔''

مولوی صاحب نے یوسف کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ'' ہمارا بس اتنا کام ہے کہ کسی طرح میگزین کے افسر تک

پہنچواور اس کے پوشیدہ کاغذات حاصل کرو' کیونکہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانی سپاہیوں کا مذہب خراب کرنے کی تجویز کی ہے۔سؤر اور گائے کی چربی سے کارتوس چکنے کیے ہیں تاکہ جب سپاہی ان کو دانت سے کاٹیں تو ہندو مسلمان دونوں کا ایمان جاتا رہے۔اگر یہ خبر سچ ہے تو افسر میگزین کے پاس اس قسم کے کاغذ ضرور ہوں گے۔ہم صرف ثبوت چاہتے ہیں تاکہ ہمارا انتقام خدا کے نزدیک جائز ہو جائے۔یہ چاروں آدمی ہندو ہیں اور ایک فوج کے ملازم ہیں۔ اور مجھ کو ایک دوسری فوج کے مسلمان افسروں نے اس کام پر مقرر کیا ہے۔"

یوسف نے کہا" ایک خانگی وجہ سے میں چچا کے گھر میں نہیں جاتا۔ پھر کیونکر میگزین تک میری رسائی ہو سکے گی۔"

مولوی صاحب مسکرا کر بولے" ہاں مجھے معلوم ہے کہ تمہاری منگنی تمہارے چچا کی لڑکی سے ہوئی ہے اور اس وجہ سے تم ان کے گھر میں نہیں جاتے' مگر اس کام کے لیے گھر میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔تم چچا سے میل جول کر کے ان کے ساتھ میگزین جانا شروع کرو اور کسی طرح وہ کاغذ نکال لاؤ۔"

یوسف نے کہا" اگر ایسا کیا بھی جائے تو میگزین کے پوشیدہ کاغذوں تک رسائی پانا محال ہے۔صاحب لوگ کاغذوں کو باہر تھوڑی ڈالے رکھتے ہیں۔"

مولوی صاحب بولے" تم ابھی سے اگر مگر نہ کرو۔جاؤ تو سہی خدا مدد دے گا اور ہم بھی تم کو ترکیبیں بتاتے رہیں گے۔"

یوسف بہت اچھا کہہ کر گھر چلا آیا اور اپنے عہد کے انجام کار پر غور کرنے لگا۔

میگزین کا دربان

رحیم بخش نامی ایک شخص میگزین کا دربان تھا۔اس کو افسر میگزین کے خانگی کاروبار میں بھی بہت دخل تھا۔یوسف جب اپنے چچا کے ساتھ میگزین میں آنے جانے لگا تو تیسرے دن رحیم بخش نے چپکے سے اس کو الگ بلایا اور کہا" تم جس فکر میں ہو' اس میں میری مدد کی بہت ضرورت ہے۔مولوی صاحب نے مجھ سے بھی حلف لیا ہے' مگر میں خود کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ صاحب کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔تم کو بتا سکتا ہوں کہ گوکھرو والے کوٹھے کے برابر جو کمرہ ہے' اس میں صاحب کے بکس رکھے ہیں اور کاغذات انہی میں رہتے ہیں۔پرسوں صاحب نے گوکھرو صاف کرنے کا حکم دیا ہے۔تمہارے چچا کاریگر لے کر آئیں گے اور تم بھی آنا اور پشت کے دروازے کا قفل کسی طرح کھول کر کمرے میں داخل ہو جانا۔"

یوسف اس بات سے بہت خوش ہوا' کیونکہ اس کو اپنے حلف کی خدمت ادا کرنے کا سراغ مل گیا تھا۔دوسرے دن وہ اپنے چچا کے ساتھ آیا اور جنگی گوکھرو کا زنگ صاف کرانے لگا۔اسی حالت میں اس نے کمرہ کا دروازہ دیکھا جس میں ایک بھاری قفل پڑا ہوا تھا۔

دوپہر کو سب کاریگر کھانا کھانے اور ذرا آرام کرنے کے لیے میگزین سے باہر گئے' مگر یوسف وہیں ٹھہرا رہا۔ پہرہ پر ایک ہندو سنتری موجود تھا۔رحیم بخش دربان نے موقع کی حالت دیکھی تو سنتری سے آ کر کہا کہ" تیرے گھر سے

ابھی ایک آدمی آیا تھا اور کہتا تھا کہ تیری بیوی کوٹھے سے گر پڑی ہے تو جلدی وہاں جا۔ میں یہاں موجود ہوں۔ تیری عوضی کے سپاہی کو بلا لوں گا۔'' سنتری یہ سن کر فوراً چلا گیا اور یوسف نے پھرتی کر کے آہنی اوزاروں سے جو کمرہ صاف کرنے کے لیے وہاں رکھے تھے، قفل کھول لیا اور کمرے میں جا کر بکس کھولنا چاہا مگر وہ بھی مقفل تھا۔ اس کو بہتیرا کھولا مگر وہ نہ کھلا۔ ناچار ہو کر قفل توڑ کر دیکھا تو بکس کے اندر کچھ بھی نہ تھا۔ یوسف نے جلدی سے دوسرا بکس توڑا۔ اس میں کاغذات تھے مگر وہ اتنے زیادہ تھے کہ اکیلے آدمی سے نہ چل سکتے تھے۔ یوسف نے کچھ دیر سوچا کہ اب کیا کرے۔ آخر اس کے خیال میں یہ بات آئی کہ لفافوں کی شکل میں جس قدر کاغذ ہیں ان کو نکال لینا چاہیے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور کاغذوں کو رومال میں باندھ کر باہر آ گیا اور پھر کمرہ کو مقفل کر دیا۔

جب کاریگر کام پر آ گئے تو یوسف میگزین سے نکل کر سیدھا مالیواڑہ گیا اور مولوی صاحب کو وہ سب کاغذات جا کر دے دیئے۔ مولوی صاحب نے فوراً ایک محرم راز گماشتہ کو بلایا جو انگریزی پڑھا ہوا تھا اور اس سے ان کاغذات کو پڑھوایا تو ان میں کارتوسوں کے متعلق کوئی کاغذ نہ نکلا۔ ایک لفافہ میں صرف اس مضمون کا خط ملا جو میرٹھ سے آیا تھا کہ ''نئے کارتوسوں کے متعلق دہلی کے سپاہیوں میں کیا چرچا ہے۔''

مولوی صاحب نے کہا ''بس معلوم ہو گیا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ جب ہی تو یہ دریافت کیا گیا ہے۔'' یوسف نے کہا ''اس میں تو کوئی شبہ کی بات نہیں ہے۔'' مولوی صاحب بولے ''میاں! ابھی تم بچے ہو۔ فریب کی باتوں کو کیا جانو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فوراً سفر کی تیاری شروع کی اور یوسف کو شاباشی دیتے ہوئے دہلی سے کہیں چلے گئے۔

غدر شروع ہو گیا

آخر اامئی کی تاریخ آ گئی اور میرٹھ کی باغی فوج نے دہلی میں آ کر غل مچا دیا۔

انگریز قتل ہو رہے تھے۔ کوٹھیوں اور بنگلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ چاروں طرف غل شور اور لوٹ مار کا ہنگامہ گرم تھا۔ یوسف ابھی اپنے کمرے سے نکل کر قلعہ کے نیچے آیا تو وہاں اس نے ایک سوار کو پہچانا جو انہی چار آدمیوں میں سے تھا جو مالی واڑہ میں ملے تھے۔ سوار نے کہا ''آؤ یوسف! تم سے ایک کام ہے۔ ہم سب میگزین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ چلو اور سیر کرو۔'' یوسف نے کہا ''میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔ میں سپاہی نہیں ہوں نہ میرے پاس ہتھیار ہیں۔'' مگر سوار نے مجبور کیا اور کہا ''وہاں لڑائی نہیں ہو گی۔ انگریز سب قتل ہو گئے یا بھاگ گئے اور دیسی فوج ساری ہمارے ساتھ شریک ہو گئی۔''

یوسف یہ سن کر سوار کے ساتھ کشمیری دروازہ تک گیا۔ جب میگزین پر پہنچے تو اس کا دروازہ بند تھا اور باغی فوج اس کو گھیرے ہوئے کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں دروازے کی کھڑکی سے اسی رحیم بخش دربان نے جھانکا اور کہا ''قلعہ سے زینے لے آؤ اور اوپر چڑھ کر اندر آ جاؤ۔ یہاں صرف چند انگریز ہیں۔'' یوسف نے رحیم بخش کے قریب جا کر پوچھا کہ ''کمرہ والی بات تو ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔'' رحیم بخش نے کہا کہ غافل شرابیوں کو ابھی کچھ بھی معلوم نہیں ہوا ہے۔''

سپاہی زینے لینے چلے گئے اور یوسف اپنے گھر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا جس سے

شہر کے درودیوار لرز گئے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زمین پھٹ گئی اور سب اس میں دھنس گئے۔ یہ آواز میگزین اڑانے کی تھی۔ دہلی میں گولے اور گولیاں اس کثرت سے برسیں جیسے زور کی بارش اور اولے پڑتے ہیں۔ ہزاروں آدمی ہلاک وزخمی ہو گئے اور کئی گھنٹے دھواں چھایا رہا اور زخمیوں کی چیخیں بلند ہوتی رہیں۔

دہلی فتح ہو گئی

انگریزوں نے مصیبت کے چند مہینے کاٹ کر دوبارہ عروج حاصل کیا۔ پنجاب کی سپاہ لے کر دہلی پر آئے اور خوں ریز معرکوں کے بعد دہلی کو دوبارہ فتح کر لیا۔

جس زمانہ میں دہلی پر گولہ باری ہو رہی تھی اور شہر کے سب باشندے بھاگ رہے تھے اس وقت یوسف کے چچا نے یوسف کے باپ سے کہا کہ "انجام برا نظر آتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یوسف کا نکاح کر دیا جائے تاکہ جب ہم سب باہر نکلیں تو پردے کی دقت نہ رہے۔" یوسف کے باپ نے اس رائے کو پسند کیا اور یوسف کی شادی ہو گئی، مگر نکاح ہوتے ہی خبر ہوئی کہ انگریزی فوج دہلی میں داخل ہو گئی اور بادشاہ قلعہ سے نکل کر مقبرۂ ہمایوں میں چلے گئے۔ یوسف کے والدین اور سب کنبہ والے بھی رتھوں میں بیٹھ کر بھاگے اور سیدھے قطب صاحب گئے۔ یوسف نے اس وقت تک دلہن کا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ قطب صاحب میں جہاں ٹھہرے وہ جگہ بہت خراب تھی اور اتنی کہ اس کنبہ کا گذارہ دشوار تھا۔ دستور کے موافق اس پریشانی میں بھی دلہن نے شرم وحیا کا لحاظ رکھا۔ آدھی رات کو یہ سب لوگ سو گئے تو انگریزی سواروں نے ان کو گھیر لیا اور یوسف کو تلاش کرنے لگے۔ یہ سب لوگ بیدار ہوئے تو سواروں نے سب مردوں کو گرفتار کر لیا اور نام معلوم کر کے یوسف اس کے باپ اور اس کے چچا کو ساتھ لے گئے اور باقی آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ جس وقت یوسف رخصت ہوا تو اس کی ماں بے قرار ہو گئی اور اس نے رو رو کر کہا کہ "یہ میری بیس برس کی کمائی ہے۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے بغیر زندہ نہیں رہوں گی۔ کل اس کی شادی ہوئی ہے۔ اس نے تو ابھی اپنی دلہن کو دیکھا بھی نہیں۔ تم اسے کہاں لیے جاتے ہو اور کیوں لیے جاتے ہو؟"

ایک سوار نے جواب دیا کہ "یہ بڑا باغی مجرم ہے۔ اس کو پھانسی دی جائے گی۔ تم اس سے آخری ملنا مل لو کہ اب یہ دوبارہ تمہارے پاس نہ آئے گا۔"

یہ سن کر یوسف کی ماں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

یوسف کی بیوی ابھی تک گھونگھٹ نکالے شرمائی ہوئی بیٹھی تھی، مگر سوار کی بات سن کر اس نے گھونگھٹ اٹھا دیا اور دونوں ہاتھ ملتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے ہونٹ شدت غم سے لرز رہے تھے۔ اس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا صرف حسرت کی نگاہوں سے یوسف کو دیکھا اور ٹکٹکی باندھ کر برابر دیکھتی رہی۔

یوسف مرد تھا مگر وہ بھی یہ نظارہ دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور مایوس نظروں سے اپنی دلہن کی حالت دیکھنے لگا۔ وہ بھی چپ تھا۔ دلہن بھی چپ تھی۔ دلہن کی آنکھوں کا سرمہ آنسوؤں کے ساتھ بہہ بہہ کر سرخ وسفید رخساروں پر دھبے لگاتا تھا اور یوسف کے چہرہ کو بھی یاس وہراس نے زرد اور خشک کر دیا تھا۔

یوسف اور اس کے باپ و چچا کے ہاتھ رسی سے باندھ دیئے گئے اور سوار ان کو لے کر روانہ ہونے لگے تو یوسف کی دلہن نے بہت دھیمی آواز سے کہا۔ ''جاؤ میں نے مہر معاف کیا۔''

پھانسی کا وقت

تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یوسف اور اس کا چچا میگزین کی سازش کے مجرم ہیں۔ یوسف کا باپ بے قصور ہے' اس لئے اس کو رہائی دی گئی اور باقی ان دونوں کو پھانسی کا حکم ہوا۔

جیل خانہ میں جہاں یہ سب قیدی بند تھے' یوسف نے ان مولوی صاحب کو بھی دیکھا جو مالیواڑہ میں ملے تھے۔ انہوں نے یوسف کو صبر کی نصیحت کی اور فرمایا ان چاروں سواروں میں ایک نے ہم سب کی مخبری کی ہے۔ یوسف نے کہا ''آپ کہاں چلے گئے تھے۔'' انہوں نے کہا'' میں میرٹھ جا کر پھر دہلی آ گیا تھا۔ مخبر نے تمام واقعات کی اطلاع افسر کو دے دی۔ رحیم بخش دربان تو میگزین کے ساتھ اڑ گیا اور میں یہیں گرفتار کر لیا گیا۔''

یوسف کے چچا نے اپنی مصیبت اور اپنی لڑکی کا قصہ مولوی صاحب سے کہا تو وہ بولے'' بے شک یہ حالات رنج کے ہیں' مگر ہم نے دین کے خیال سے یہ سب کچھ کیا تھا' کیونکہ ہم کو یقین تھا کہ انگریز ہم کو کرسٹان بنانا چاہتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ انگریزوں کی کچھ خطا نہ تھی اور فساد پسند لوگوں نے جھوٹی افواہیں مشہور کی تھیں' لیکن چونکہ ہماری نیت نیک تھی اور ہم نے محض اپنے مذہب کی محبت میں یہ کام کئے تھے۔ اس واسطے خدا ہم کو جزائے خیر دے گا اور ہم شہیدوں کی موت مریں گے اور گناہ ان کی گردن پر ہوگا' جنہوں نے جھوٹی خبریں مشہور کر کے یہ غدر کرایا۔''

یوسف نے کہا'' آپ تو کاغذ دیکھ کر فرماتے تھے کہ اس میں انگریزوں کا فریب ہے۔ اب آپ ان کو بے گناہ کہتے ہیں۔'' مولوی صاحب نے کہا'' اس وقت میرا یہی خیال تھا مگر میرٹھ جا کر جب کاغذات اور حالات پر غور کیا گیا تو میں نے فوجی افسروں سے کہہ دیا تھا کہ انگریزوں کی بدنیتی کا کوئی ثبوت نہیں ہے' لیکن وہ نہ مانے اور فساد کر ہی دیا۔''

صبح کو یہ سب لوگ پھانسی گھر کے سامنے لائے گئے۔ پہلے مولوی صاحب کو لٹکایا گیا اور انہوں نے آواز دے کر کہا کہ'' خبردار کوئی شخص ہمت نہ ہارے ہم سب غلط فہمی کا شکار ہیں۔ خدا ہم کو معاف کرے گا اور ان کو سزا دے گا جنہوں نے انگریزوں کی عورتوں اور بچوں پر ظلم کئے۔'' مولوی صاحب کے بعد یوسف اور اس کے چچا کو بھی پھانسی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

شہزادہ کی جاروب کشی

آج اور کل کے فرق کو سمجھنے میں یورپین اور ایشیائی فلاسفروں کے اقوال پر غور کرنے سے بہت آسانی ہو جاتی ہے' مگر اس کو صرف دماغ سمجھ سکتا ہے۔ آنکھ کو مشاہدے کا لطف نہیں آتا۔

۱۴ اگست ۱۹۱۴ء سے جرمنی قوم کا ''آج'' پیش نظر تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ''کل'' کیا ہوگا' مگر ۱۹۱۸ء نے

بتادیا' دکھادیا اور سمجھادیا کہ 'کل' کی یہ حالت ہے اور ایسا دکھایا کہ اب فلسفہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔

روس کا 'آج' صدیوں سے مشہور تھا۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کی آمد ہندوستان کا چرچا سنتا تھا اور ایک خوفناک وحشی اور موذی حریف کی چڑھائی کو آفت امن خیال کرتا تھا' لیکن 'آج' ختم ہوا اور 'کل' ایسا دیکھنے میں آیا کہ روس کا تاج و تخت ہی اوندھا ہو گیا۔ دہلی میں مغلیہ خاندان کا غلغلہ' اس کی تیغ زنی اور بزم آرائی کے وہ گوناگوں صفات کے سبب گھر گھر شور مچا ہوا تھا اور ہندوستان کا کوئی خطہ ان کی عظمت سے انکار کرنے کی مجال نہ رکھتا تھا' مگر جب ان کا 'آج' ختم ہوا تو 'کل' کی حالت کسی سے نہ دیکھی گئی۔

ایک دہلوی نے گریٹ مغل اور مغل اعظم کی تباہی کے افسانے خود انہی سے سن کر قلم بند کئے جن پر یہ افتاد پڑی تھی تو ہندوستان نے لکھنے والے کے ان مضامین کو ماسٹر پیس کا خطاب دیا اور اس کی انشاپردازی کو ان افسانوں کے باعث ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی۔ دہلوی محرر نے خیال کیا۔ میری انشا کے کمال کو دیکھا جاتا ہے۔ واقعات پر کسی کی نظر نہیں جاتی اور کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ان سچے قصوں سے اپنی زندگی کے 'آج' اور 'کل' کو سمجھے اور نتائج نکال کر عبرت حاصل کرے۔

جو قوم پستی میں گرتی ہے' وہ مقصود کے ذرائع کو مقصود بنالیتی ہے۔ یہی حال ہندوستان کا ہے کہ اس نے تحریر کی داددی۔ اس پر واہ واہ کی اور واقعات اصل کی گہرائی پر کسی کی نظر نہ گئی اور گئی تو اس کی تاثیر کو ظاہر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

۱۹۱۷ء میں اپنے پیارے عزیز ملا محمد واحدی اڈیٹر اخبار 'خطیب' و رسالہ 'نظام المشائخ' کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ میز پر سر جھکائے کام کر رہے تھے۔ ان کا عملہ بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھا اور میں ایک جاروب کش کو دیکھ رہا تھا جو مستعدی سے صحن کو صاف کرتا تھا اور چمن کے پھولوں کو دیکھتا جاتا تھا۔ جب وہ کمرہ کا صحن صاف کر چکا تو نل سے پانی لے کر پھولوں میں پانی ڈالنے لگا۔ پانی ڈالنے میں اس کے ہاتھ پھولوں کے ساتھ ایسی محبت کا اظہار کرتے تھے کہ اس کو میرے دل نے گل پرست خیال کرنا شروع کیا۔ جاروب کش نے ہر گملہ کا کوڑا صاف کیا' مرجھائے ہوئے پتے توڑ کر پھینک دیئے اور گملوں کو قرینہ سے درست کرنے لگا۔ اتنے میں واحدی صاحب نے آواز دی۔

''محمود جاروب کش۔''

''حاضر ہوا جناب'' کہہ کر دوڑا اور ہاتھ باندھ کر سامنے آ کھڑا ہوا اور ایک تازہ خدمت کا حکم سن کر تعمیل کو باہر چلا گیا۔

اس کی پھرتی' اس کی شائستگی' اس کا باقرینہ ادب مجھ کو بہت اچھا معلوم ہوا اور میں نے خیال کیا کہ ایسا تمیزدار نوکر بہت کم دیکھنے میں آیا ہوگا۔ واحدی صاحب سے جاروب کش محمود کا حال پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تیموری شہزادہ ہے اور شہنشاہ دہلی سے بہت قریبی واسطہ رکھتا ہے۔ مجھ کو اس اطلاع نے جس تلاطم میں ڈالا' وہ روس کے اس باشندہ کی بیقراری سے زیادہ تھا جب کہ اس نے اپنے تاجدار کے قتل کی خبر سنی ہوگی' کیونکہ وہ ایک موت کی خبر تھی جو ختم ہو گئی اور یہ ایک زندگی کی اطلاع تھی جس کے ختم ہونے کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ اس دن کے بعد میں جاروب کش محمود کو اس کے قدیمی لقب ''صاحب عالم'' سے یاد کرتا تھا' کیونکہ مغلی تخت کی بحالی کے ایام میں سب شہزادوں کو صاحب عالم کہا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آخری ایام میں انگریز افسر بھی ادنیٰ سے ادنیٰ متوسل نسل شاہی کو صاحب عالم کے بلند خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔ میرزا محمود

ایک نوجوان آدمی ہے۔اب بھی دفتر اخبار 'خطیب' کے قریب اس کا مکان ہے۔ چھوٹے بچوں کا باپ ہے جو شاید اب تک اپنے فخر کو بھولے نہیں ہوں گے' کیونکہ پیٹ کی مجبوری سے جب اپنے باپ کو خدمت گاری کرتے دیکھتے ہیں تو شرماتے ہیں۔ فاتح قوم کے بچوں کو کام کرنے اور مشقت سے روزی پیدا کرنے میں کبھی عار کا خیال نہیں ہوتا بشرطیکہ ان کو امید ہو کہ وہ اس تکلیف کے بعد پھر ایک عروج اور کامیابی کے زمانہ میں جانے والے ہیں' ورنہ زندگی ان کو دوزخ نظر آنے لگتی ہے۔ تیمور' بابر' ہمایوں نے اپنے پوتے میرزا محمود سے زیادہ زمانے کی جفا اور دنیا کے خطروں کا تماشا دیکھا تھا' مگر آخر میں سب ختم ہو گئے۔ میرزا محمود قیامت تک یہ توقع نہیں کر سکتا کہ اس کی گردش کے دن بھی کبھی پھریں گے اور وہ ذلیل خدمت گاری سے نجات حاصل کرے گا۔ میرزا محمود کو شاید 'آج' اور 'کل' کے فرق سمجھنے کا بھی خیال نہ آتا ہو گا۔ ورنہ وہ ایک ہی دن میں کامل ولی بن جاتا اور غدر لینے والے اس کے گھر پر سر جھکاتے ہوئے آتے۔

اسی دن جب کہ مجھ کو میرزا محمود کی حالت کا علم ہوا' واحدی صاحب نے بیان کیا کہ ان کے چھاپہ خانہ میں ایک مزدور جو کل چلانے کا کام کرتا ہے' حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا پوتا یا نواسا ہے۔ دل میں سیاسی زخم کے برابر ایک مذہبی زخم بھی لگا۔ کیا خدا کی شان ہے کہ وہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ جن کی شاگردی اور علمی خوشہ چینی کا آج تمام ہندوستان اقرار کرتا ہے' ان کے پوتے یا نواسہ کی یہ حالت ہو کہ وہ چار آنے کی مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہے۔ اس سے موجودہ ہندوستان کے بڑے آدمی 'آج' اور 'کل' کا نتیجہ نکال سکتے ہیں اور ان کو اپنے عروج و اقتدار کی ناپائداری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسپین کے قصر الحمراء اور اس کے بسنے والوں کی بربادی تاریخوں میں پڑھ کر دل کی عبرت آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے' مگر لال قلعہ دہلی کے رہنے والوں اور ہندوستان پر خود مختار حکومت کرنے والوں کی تباہی پر کوئی ایک آنسو بھی نہیں بہاتا۔ محمود جاروب کش کا قدیمی مکان دفتر 'خطیب' سے سو قدم کے فاصلے پر لال قلعہ میں تھا' جہاں جواہرات جڑے ہوئے پاخانے' غسل خانے تھے' جہاں تاج و تخت کی دھوم تھی' جہاں لونڈی غلام کمریں باندھے ہوئے دوڑتے پھرتے تھے۔ یہ وہی شہزادہ محمود ہے' جس کو ابھی ایک چھاپہ خانہ میں جھاڑو دیتا دیکھا گیا تھا' جو "حاضر جناب" کہہ کر اپنے آقا کے سامنے دوڑا ہوا آیا تھا اور جو دست بستہ انتظار حکم میں خاموش کھڑا ہو گیا تھا' جس کے بڑے بڑے اعظم ہندوستان کے بلاشرکت غیر حکمران تھے' جن کے سامنے بڑے بڑے نواب راجہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اور اپنے بادشاہ کے بلاوے پر "حاضر حضور" کہہ کر بے تحاشا دوڑتے تھے۔ شہزادہ محمود کو یاد نہ ہو گا' تاریخ کو سب کچھ یاد ہے۔ شہزادہ محمود کے دل کو قدرت نے صبر دے دیا' مگر مورخ کیونکر صبر کر سکتے ہیں اور کس طرح اس عجیب انقلاب کو دل سے فراموش کر سکتے ہیں۔

شہزادہ محمود آج ایک ایسے مکان میں رہتا ہے جہاں ان کے بڑوں کا ایک کمین سے کمین غلام بھی رہنا پسند نہ کرتا۔ نہ پکی دیوار ہے نہ پکی چھت ہے' نہ پکا صحن ہے۔ کچی مٹی کی دیواریں ہیں' جن میں کوئلہ اور ٹھیکریوں کی پچی کاری ہے اور جن پر بارش کی بوندوں نے خاک کے ذروں کو چیر چیر کر گلکاریاں بنائی ہیں۔ شہزادہ محمود کو آج وہ کھانا ملتا ہے جو اس کے بزرگوں کے خدمتگاروں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ وہ سوکھی روٹیاں چٹنی سے کھا لیتا ہے۔ وہ ابالی دال سے پیٹ بھر لیتا ہے اور یہ بھی میسر نہ آئے تو اپنے معصوم بچوں کو تسلی دیتا ہوا فاقے میں پڑ کر سو جاتا ہے۔ شہزادہ محمود کے پاس نہ کمخواب کے کپڑے ہیں نہ زربفت کے۔ وہ اور اس کے بچے پیوند لگے ہوئے گاڑھے گزی کے کپڑے پہنتے ہیں اور سردی آ جائے تو چکٹی ہوئی

گدڑیوں اور بوسیدہ کمبلوں کو اوڑھ کر رات بسر کرتے ہیں۔

آج جب کہ دسمبر ۱۹۱۸ء کا مہینہ ہے۔ دہلی میں نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسے ہو رہے ہیں اور بیرونی مہمان گرم کمروں میں قیمتی لحاف اور قیمتی کمبل اوڑھے پڑے سوتے ہیں۔ آج گورنمنٹ ہاؤس میں ہندوستان کے حکمران آگ کی انگیٹھیوں کے آس پاس کرسیوں پر لیٹے باتیں کر رہے ہیں۔ ٹھیک آج ہی کے دن شہزادہ محمود اور اس کی طرح سینکڑوں شہزادے ٹوٹے پھوٹے مکان میں گیلی اور ٹھنڈی خاک پر بوریئے بچھائے اور پھٹی ہوئی رضائیاں اوڑھے بھوکے پیاسے پڑے ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ اس کو کچھ بہت دن نہیں ہوئے' صرف ساٹھ برس کا زمانہ گذرا ہے کہ اسی دہلی میں لال قلعہ آباد تھا۔ اس میں شہزادہ محمود کے بزرگ شال دوشالے اوڑھے' سونے چاندی کی مسہریوں میں پاؤں پھیلائے' بے غل وغش پڑے سوتے تھے اور ان کو یہ کیفیت خواب میں بھی نظر نہ آتی تھی کہ ان کی اولاد ایک دن محتاجوں اور بے کسوں کی زندگی بسر کرے گی۔ اگر ان کے خواب میں یہ حالت کبھی آ جاتی تو وہ ضرور ایک نوشتہ موجودہ دہلی کے عیش پرستوں کو لکھ جاتے کہ وقت کی گردش کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ شہزادہ محمود کے بچے اگر اپنے بڑوں کا پہلا وقت یاد کر کے کہیں کہ ہم کو بھی دوشالے منگوا دو اور ہم کو بھی سنہری روپہلی مسہریاں بنوا دو' ہم بھی سونے چاندی کے برتنوں میں پلاؤ قورمے کھائیں گے۔ ہم کو بھی ہندوستان کے راجہ نواب صاحب عالم پناہ کہہ کر اور جھک جھک کر سلام کریں تو بیچارا محمود سوائے اس کے کہ آنکھوں میں آنسو لے آئے اور آسمان کو دیکھ کر کلیجہ مسوس لے اور کیا خاک جواب دے سکے گا۔

دہلی والوں کو معلوم ہے کہ لال قلعہ کے شہزادے بڑے موسم پرست تھے۔ سردی' گرمی اور خصوصاً برسات کے موسموں سے خوب لطف اٹھاتے تھے۔ ہر موسم کی ترکاریاں' ہر موسم کے کپڑے' ہر موسم کے کھانے دریادلی سے غریبوں' محتاجوں کو بانٹنے اور کھلا کر کھانے کا ان کا معمول تھا' مگر آج شہزادہ محمود کے بچے نہ سردی کی کوئی اچھی چیز کھا سکتے ہیں' نہ گرمی کی' نہ برسات کی بہار ان کے گھر میں آتی ہے نہ اور کوئی خوشی۔ ان کو تو پیٹ بھر کر روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی پورا نصیب نہیں ہوتا۔ وہ بالکل بھول گئے کہ ہم شہزادے ہیں۔ ان کو بالکل یاد نہیں کہ ہم اس دہلی اور ہندوستان کے بادشاہ تھے۔ آج تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک خدمتگار باپ کے بچے ہیں جو دس روپے مہینہ کا نوکر ہے' جو صبح اندھیرے سے نوکری پر جاتا ہے اور رات کو اندھیرے میں واپس آتا ہے۔ ان بچوں کو اس کی خبر نہیں کہ ان کے بڑے عید کے دربار کرتے تھے اور لاکھوں روپے اور شال دوشالے غریبوں کو تقسیم کرتے تھے۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ کسی عید میں ان کو نئی جوتی نصیب نہیں ہوتی اور نہ کوئی نیا کپڑا بنتا ہے' کیونکہ ان کا باپ کہتا ہے کہ بیٹا اب کی جوتی اور کپڑا مہنگا ہے۔ میاں نے تنخواہ جو دی تھی' وہ آٹے والے کے پاس چلی گئی اور پھر بھی اس کا قرضہ باقی رہ گیا۔ خدا دے گا تو تم کو چوک پر سے پرانی جوتیاں خرید کر لا دیں گے اور وہ ان ہی کہنہ اور پرانی جوتیوں کے شوق میں انتظار کا زمانہ خوشی سے کاٹ دیتے ہیں۔ جنگی بخار کے زمانہ میں جب کہ ان بچوں کا باپ زمین پر بخار میں پڑا ہوا ہائے ہائے کرتا تھا' ان بھولے اور معصوم بچوں نے کئی کئی وقت فاقوں میں گذار دیئے اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دعائیں مانگیں کہ اللہ میاں ہمارے ابا جان کو اچھا کر دو۔ چھوٹے بچے نے اگر روٹی کی ضد کی تو بڑی بہن نے اس کو کلیجہ سے لگا لیا اور کہا "دیکھو ابا اچھے ہو جائیں تو آٹا لائیں گے۔ اماں روٹی پکائیں گی۔ ہم تم مل کر کھائیں گے۔" بچہ کہتا "ابا کب اچھے ہوں گے؟ مجھے تو بھوک لگی ہے۔" تو بہن کہتی "گھبراؤ نہیں اب اچھے ہو جائیں گے اور بازار جائیں گے۔"

بچہ مصیبت کی ماری شہزادی یعنی اپنی ماں کے پاس جاتا اور کہتا تو اماں جان روٹی دیتی' اس کو پیار کرتی اور کہتی "بیٹا! روٹی کہاں سے لاؤں۔ خدا کمانے والے کو جان سے بچالے۔ ابھی تو اسی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ میاں ہم غریب لوگ ہیں نہ ہمارے پاس دوا ہے نہ روٹی ہے نہ کپڑا ہے۔ خدا خوش رکھے حکیم اجمل خان کو جنھوں نے دوائی کا اور کھانے کا بندوبست کیا اور خدا خوش رکھے اس محلّہ کے نیک آدمی محمد علی کارخانہ دار کو جو تمہارے ابا کی اور سارے محلّہ کے بیماروں کی خبر گیری کررہے ہیں۔ انہوں نے کھانے کو بھی پوچھا تھا مگر میں غیرت کے مارے کہہ نہ سکی کہ میرے یہاں کھانا نہیں ہے۔ ہم تیموری نسل کے لوگ ہیں' کیونکر بھیک مانگیں اور خیرات کی روٹی طلب کریں۔ یہ ہی بہت ہے کہ خیرات کی دوا تمہارے ابا کے لیے لے لی ہے۔ دیکھو بیٹا! تم ہندوستان کے بادشاہ کی اولاد ہو اور بادشاہ کی اولاد بھیک نہیں مانگا کرتی اور نہ خیرات لیتی ہے۔ تم بڑے ہوکر کبھی بھیک نہ مانگنا اور اپنے ابا کی طرح محنت مزدوری کرکے روٹی کمانا۔" بچہ نے رو کر کہا "اچھا اماں! میں کسی سے نہیں مانگوں گا' مگر تم تو مجھے روٹی دو۔" اس وقت اس محتاج اور بے بس شہزادی نے آسمان کو دیکھا اور کہا "اے مالک! تو ہی سب کا رزاق ہے۔ تو ہی سب کا عیب پوش ہے۔ یہ معصوم بچے بھوک میں بلبلا رہے ہیں۔ میں کس سے اپنا دکھڑا کہوں اور تیرے سوا اور کون سننے والا ہے۔ ہم پر رحم کر اور بیمار کو اچھا کردے۔ خدا کے فضل سے اب شہزادہ محمود تندرست ہوگیا اور کسی اچھے روزگار میں مصروف ہے جہاں اس کے مصارف کی ضرورتوں میں کمی نہیں پڑتی۔"

مگر 'آج' اور 'کل' کے فرق سمجھنے کو اس کی اور اس کے خاندان کی حالت جو دہلی میں آباد ہے اور جس کی پریشانیاں اظہر من الشمس ہیں' بہت کافی ہیں اور بغیر کسی فلسفیانہ منطق کے انسان عروج و زوال' ذلت و عزت' بے نیازی و محتاجی کا عینی تماشہ دیکھ سکتا ہے اور نتیجہ نکالنے میں اس کو کچھ مشکل پیش نہیں آتی۔

او جاروب کش شہزادے! تو اور تیری موجودہ زندگی' تیرے خاندان کے گذشتہ عروج کا تصور کرنے کے بعد دنیا کے حکمرانوں اور دولت کے دیوانوں کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہوسکتی ہے اور فانی جاہ و منزلت کا غرور دماغ سے اس طرح نکل جاتا ہے جس طرح دھوپ سے سیل اور ترشی سے نشہ اور یہی اس سرگذشت کے لکھنے کا مقصد ہے۔

☆ ☆ ☆

غدر کی سیدانی' ذکیہ بیابانی

یہ بالوں کے جلنے کی بُو کہاں سے آتی ہے۔ شاید پڑوس والے عامل صاحب کسی کے لیے کوئی عمل کررہے ہیں۔ جب سے ان کے پڑوس میں مکان لیا ہے' یہی آفت برپا رہتی ہے۔ کبھی گگل جلتا ہے اور اس کی چکرا ہند سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ کبھی کوئی گل جلتا ہے اور گھر میں بیٹھنا دوبھر ہوجاتا ہے۔

ذکیہ کی والدہ نقیہ نے کہا "ہاں بیٹی! یہ عامل سفلی کا عمل جانتے ہیں اور اس میں اسی قسم کے خرافات ہوا کرتے ہیں۔ پرسوں سنا تھا نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے اپنے کسی خاص رازدار کو اس عامل کے پاس بھیجا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی دشمن کے خلاف جادو کرانے کی ضرورت پیش آئی ہوگی یا اپنے شوہر حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی

محبت زیادہ کرنے اور اپنی طرف ہی متوجہ رہنے کے لیے کوئی عمل کرایا ہوگا' مگر پہلا خیال درست معلوم ہوتا ہے' کیونکہ بال جلنے کی بُو آتی ہے اور بال عداوت اور بغض کے عملیات میں جلا کرتے ہیں۔"

ذکیہ بولی "نہیں بی۔ میں نے باوا جان سے سنا ہے کہ محبت بڑھانے یا پیدا کرانے کے اعمال میں بھی مطلوب کے بال جلا کرتے ہیں۔"

نقیہ نے کہا "جو کچھ بھی ہو۔ ہمارا تو اس پڑوس سے ناک میں دم ہے۔ تمہارے والد نے خبر نہیں ایسی جگہ مکان کیوں لیا ہے' جہاں رات دن اس قسم کے واہیات اور خلاف شریعت کام ہوتے ہیں۔" ذکیہ بولنے نہ پائی تھی کہ اس کے والد حضرت سید نور الہدیٰ تشریف لے آئے۔ سفید داڑھی' سفید عمامہ' سفید چوغہ' سفید رنگت' ستر برس کا سن و سال۔ زہد و عبادت کے نور سے چہرے پر ایک چمک اور جلال۔

ذکیہ نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا "باوا جان! آپ کو کئی دن ہو گئے۔ چلتے وقت تو آپ نے فرمایا تھا کہ صرف ایک دن کے لیے جاتا ہے۔ گڑگانوہ میں کسی صاحب سے مل کر کل تک واپس آ جائیں گے۔"

سید نور الہدیٰ صاحب نے جواب دیا "ہاں بیٹی مجھ کو رکنا پڑا۔ ان لوگوں نے دو دن تک نہ آنے دیا۔ کہو تم نے وہ چالیسوں حدیثیں یاد کر لیں جو چلتے وقت میں نے تم کو پڑھائی تھیں؟"

ذکیہ نے کہا "جی ہاں۔ میں نے ان کو حفظ کر لیا اور ترجمہ بھی یاد ہو گیا' مگر مجھ کو اس حدیث میں کچھ دریافت کرنا ہے کہ دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ (چھوڑ اس کو جو تجھ کو شبہ میں ڈالے اور اختیار کر اس کو جو بے شبہ ہو)۔ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا کہ جس چیز میں شبہ ہو اس کو کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ ہر معمولی آدمی کی طاقت سے بڑھ کر ہے کہ وہ بے شبہ چیز اختیار کرے' کیونکہ آدمی کا دل ہر بات میں شبہ پیدا کرتا ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی جو بالکل بے شبہ ثابت ہو جائے۔"

سید نور الہدیٰ نے فرمایا "بیٹی! یہ حدیث تین لاکھ حدیثوں سے چھانٹی گئی ہے اور اس میں ایک ایسا فلسفہ ہے جس کی ہر مسلمان کو ضرورت پڑتی ہے' دینی کاموں میں بھی اور دنیا کی باتوں میں بھی۔ ایک اور حدیث الاعمال بالنیات (سب کام نیت پر منحصر ہیں) بھی اسی قسم کی ہے جو ہمارے سب کاموں میں مدد دیتی ہے' کیونکہ ہر عمل کی اچھائی اور برائی نیت سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک آدمی ظاہر میں اچھا کام کرتا ہے' مگر نیت برائی کی رکھتا ہے' تو وہ کام اچھا نہ کہا جائے گا اور خدا تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں بدی لکھے گا اور دیکھنے میں کوئی کام برا ہو اور نیت نیکی کی ہو' تو وہ کام نیکیوں میں شمار ہوگا۔ تم نے سنا نہیں ایک آدمی نے مسجد کے سامنے کھونٹی گاڑی تھی کہ نمازی مسافر اس سے اپنے گھوڑے باندھ کر نماز پڑھیں گے' مگر کسی نے اس سے گھوڑا نہ باندھا اور رات کے وقت بیسیوں آدمی اس کھونٹی سے ٹھوکریں کھا کر گرے اور ان کے چوٹیں لگیں' مگر خدا نے کھونٹی گاڑنے والے کے اعمال میں ثواب لکھا کیونکہ اس کی نیت اچھی تھی۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ لوگ اس سے ٹھوکریں کھائیں اور ایک آدمی نے کھونٹی اس لیے گاڑی تھی کہ لوگوں کے ٹھوکریں لگیں اور نمازیوں کو تکلیف ہو اور وہ نماز سے باز رہیں' مگر کسی کے ٹھوکر نہ لگی بلکہ انہوں نے اس کھونٹی سے گھوڑے باندھے اور اطمینان سے مسجد میں جا کر نماز پڑھی۔ اس شخص کی چونکہ نیت خراب تھی اس واسطے اس کے نامہ اعمال میں گناہ لکھے گئے۔ پس ہر بات نیت پر منحصر ہے اور اس

حدیث نے قیامت تک کے اچھے برے کاموں کے دو لفظوں میں فیصلہ کر دیا ہے۔ یہی حال اس حدیث کا ہے جس کو تم نے پوچھا کہ اس میں بھی مسلمان کو دینی اور دنیاوی اعمال کا ایک قرینہ بتایا گیا ہے کہ شک وشبہ کے کاموں سے بچو اور شک وشبہ سے پاک کاموں کو اختیار کرو۔

''اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ کم علم اور کم عقل کے آدمی شک وشبہ اور بلا شک وشبہ کی باتوں کی آسانی سے تمیز نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ تم نے سوال کیا ہے' مگر حدیث شریف کا منشاء مسلمانوں کو مشکل میں ڈالنے کا نہیں ہے۔ اس نے تو اس حکیمانہ مقولے سے مشکلوں کو آسان کر دیا ہے۔ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ'' (دین آسان ہے) تم نے پڑھا ہوگا۔ ہمارے دین اسلام میں کوئی بات دشواری اور مشکل کی نہیں ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان لوگ ڈگدا میں نہ رہیں بلکہ ایک صاف اور یقینی راستہ دین کے معاملات میں اختیار کریں۔ ڈگدا کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کو کرتا ہے مگر اس کے دل میں دھکڑ پکڑ رہتی ہے کہ خبر نہیں یہ اچھا ہے یا برا۔ رسول اللہ صلعم کا منشاء یہ ہے کہ مسلمان دھکڑ پکڑ میں نہ رہے اور جس میں ذرا بھی ڈگدا ہو وہ کام نہ کرے۔

''میں تم کو مثال دے کر سمجھاؤں۔ ایک آدمی کہتا ہے خدا ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہے۔ تیسرا کہتا ہے خبر نہیں وہ ہے یا نہیں۔ مجھے اس میں کچھ شک ہے۔ اب تینوں میں دو آرام سے ہیں۔ جو صاف اقرار کرتا ہے اس کو بھی آرام ہے۔ جو صاف انکار کرتا ہے وہ بھی مطمئن ہے۔ مشکل اس دھکڑ پکڑ والے کی ہے جو کبھی خیال کرتا ہے خدا ہے اور کبھی سوچتا ہے' نہیں ہے۔

''اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملات میں جو بات قرآن اور رسول خدا صلعم کے حکم کے خلاف اور عقل کے مخالف نظر آئے اور لوگ کہیں کہ یہ خلاف نہیں ہے اور اپنی دلیلوں کے زور سے تم کو شبہ میں ڈالیں تو تم شک میں نہ پڑو اور قرآن وحدیث کے بلا شبہ طریقہ پر جمے رہو۔

یا دنیا کے کسی کام میں تمہاری عقل اور تمہارے سچے دوستوں اور خیر خواہوں کا مشورہ کچھ اور کہتا ہو اور خلقت کچھ اور رائے دیتی ہو تو تم کو اپنی عقل اور اپنے دوستوں کے مشورہ پر عمل کرنا چاہئے کہ یہ بلا شبہ ہے اور خلقت کی رائے پر نہ چلو کہ اس میں شک وشبہ کا امکان ہے۔

ذکیہ نے کہا''یہی تو میرا سوال ہے کہ معمولی علم وعقل کا آدمی شک وغیر شک میں کیونکر فرق کر سکتا ہے۔''

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا''آگ کا کام جلا دینا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آگ جلاتی نہیں' تو کون اس کو قبول کرے گا۔ اسی طرح خدا نے سب آدمیوں کو نفع نقصان کے سمجھنے کی عقل دی ہے۔

ایک آدمی کہتا ہے میں مسلمان ہوں۔ رسول خدا صلعم کا کلمہ پڑھتا ہے مگر میری شان خدا نے ایسی بنائی ہے کہ اگر مجھ کو اپنا بزرگ تم نہ مانو گے تو خدا اور رسولؐ پر تمہارا ایمان لانا بے کار سود ہوگا' کیونکہ میری اطاعت تم پر فرض ہے۔

اس دعویٰ میں یہ شک ہے کہ اسلام کا مطلب تو خدا کی یکتائی اور رسولؐ خدا کی رسالت کا قبول کرنا ہے اور اگر کوئی آدمی اس کو قبول کرلے اور قرآن کو اپنا پیشوا بنالے تو پھر اس کو کیا ضرورت ہے کہ اپنے جیسے آدمی کو خدا رسولؐ کے برابر سمجھے اور اس کا زر خرید غلام بن جائے کیونکہ خدا اور رسول خداؐ اور قرآن والی قرآن کی اطاعت کافی ہے۔ ایسے آدمی کی

اطاعت ضروری نہیں۔ جو یہ ہے کہ مجھ کو نہ مانو گے تو خدا رسولؐ پر بھی تمہارا ایمان غلط ہو جائے گا۔''

ذکیہ نے کہا'' تو کیا ہم اپنے ہدایت کرنے والے اور خدا کا راستہ بتانے والے لوگوں کی اطاعت نہ کریں۔''

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا'' نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ رسول کی اطاعت کرو اور اصحاب امر کی اطاعت کرو۔ اصحاب امر سے مراد یہی لوگ ہیں جو خدا رسول کا راستہ ہم کو بتاتے ہیں۔ میں مخالف تو اس اطاعت کی کرتا ہوں جو یہ کہہ کر حاصل کی جائے کہ مجھ بندہ کی اطاعت کرو ورنہ خدا اور رسول خداؐ پر تمہارا ایمان لانا بے کار نہ ہوگا اور تم مومن نہ بن سکو گے۔ اس قول میں شک ہے' اس لئے اس کو ترک کر دینا چاہئے اور خدا رسولؐ اور قرآن واہل بیت کی اطاعت بلاشبہ ہے۔ لہٰذا اس کو اختیار کر لینا چاہئے۔'' ذکیہ بولی'' تو اگر کوئی امام یا مذہبی پیشوا قرآن وحدیث پر عمل کرانے اور ہماری دنیاوی اصلاح کرنے کے لئے اطاعت کا طلب گار ہو تو وہ بھی بندے کی اطاعت ہوگی اور بندہ کی اطاعت میں آپ نے شبہ فرمایا ہے۔''

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا'' نہیں ایسے امام یا پیشوا کی اطاعت عین رسولؐ اور خدا کی اطاعت ہے۔ جو قرآن کے بموجب حکم دیتا ہو اور جو امام یا پیشوا یہ کہے کہ تم قرآن نہ پڑھو۔ تم حدیث نہ پڑھو۔ تم علم دین حاصل نہ کرو' کیونکہ تم کو اس کی سمجھ نہیں ہے۔ صرف میری اطاعت کرو اور مجھی کو قرآن' رسولؐ اور امام کا قائم مقام جانو' تو ایسا شخص اطاعت کے قابل نہیں ہے' کیونکہ قرآن شریف کی سب سے پہلی آیت میں علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث شریف میں رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنا عورت مرد پر فرض ہے۔ پس جو شخص دوسروں کو علم حاصل کرنے اور قرآن وحدیث پڑھنے سے روکتا ہے اور صرف اپنی اطاعت پر زور دیتا ہے وہ بالکل چھوڑ دینے کے قابل ہے' کیونکہ اس میں شک وشبہ ہے اور شک وشبہ کے راستہ کو رسول خداؐ نے ترک کر دینے کا حکم دیا ہے۔''

ذکیہ نے کہا'' اب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ رسول خداؐ نے اس حدیث میں ہمارے بہت بڑے فائدے کی بات فرمائی ہے۔ خدا ہم کو عمل کی توفیق دے۔''

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کا خواب

سید نور الہدیٰ نے دس مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو اپنی بیوی نفیسہ اور لڑکی ذکیہ سے رات کا اپنا ایک خواب بیان کیا اور کہا '' میں نے ایک ہولناک آگ آسمان سے برستی دیکھی ہے جس سے آدمی اور جانور جل جل کے مر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں اس کی تعبیر یہ آتی ہے کہ ملک میں کوئی خوفناک فساد ہونے والا ہے۔''

ذکیہ نے کہا'' فساد کی تعبیر آپ نے کیوں کی۔ قحط' بیماری وغیرہ بلائیں بھی تو اس خواب سے مراد ہو سکتی ہیں۔''

سید نور الہدیٰ نے فرمایا'' مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ تم نہیں جانتیں۔ میں آج کی تاریخ سے پورے سو برس تک کے حالات جانتا ہوں۔ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہم کو سو برس آئندہ تک کے واقعات بتا دیئے ہیں۔ میں اپنی شہادت' تمہاری معصیت اور اے ذکیہ تیری دردناک پریشانیاں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' مگر اف نہیں کر سکتا کہ مشیت کا لکھا پورا ہو کر رہے گا۔''

ذکیہ یہ سن کر خوف زدہ ہوگئی' لیکن چونکہ تعلیم یافتہ تھی' مطمئن ہو کر بولی "جب آپ کو سب کچھ دکھا دیا گیا ہے تو ہماری اور اپنی سلامتی کے لیے دعا کیوں نہیں کرتے۔"

سید نور الہدیٰ نے فرمایا "اس واسطے دعا نہیں کر سکتا کہ مجھ کو دکھا دیا اور بتلا دیا گیا ہے کہ ازل کا نوشتہ ان مٹ ہے۔ اعمال کی سزا کا ملنا لازمی ہے۔ اس میں کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں ہے۔ اے ذکیہ! میں امام ہشتم کی اولاد میں ہوں۔ میرا نسب آج تک بالکل درست اور صحیح ہے اور خدا کے فضل سے میرے اعمال بھی برے نہیں ہیں۔ میری شہادت اعمال ذاتی کی سزا نہیں' بلکہ اجداد کی سنت ہے۔ تُو اور تیری ماں کو بھی یہی خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے بزرگوں کی طرح مصیبتوں میں صبر و سکون سے کام لینا۔ گھبرا نہ جانا کہ ہمارا خون ایک دن امت رسول کی بہتری کے کام آنے والا ہے۔"

نامفہوم الفاظ

یہ کہہ کر سید صاحب نے ایک جذب کی سی حالت میں فرمانا شروع کیا "ایک برس میں خون' دوسرے برس میں بربادی' تیسرے سال ٹھوکریں' چوتھے سال زوال' وبال' بھونچال' پھر جھولا۔ کوئی نیچے آئے گا۔ کوئی اوپر جائے گا۔ اس کے بعد ساٹھ برس گذر گئے تو خون' بے امنی۔ دریا زمین کو نگل گیا۔ زمین سورج کو کھا گئی۔ لوہا اور تانبا بولنے لگا اور زبانیں گونگی ہوگئیں۔ دو پیسہ کا مزدور تخت پر اور تخت چھپر کے اندر۔ مٹی کے چراغ میں لعل بدخشاں کی روشنی۔ ذکیہ کے بچے تازیانے کی سرکشی' مسلمان پہاڑ پر اور سب زمین پر۔"

سید صاحب یہ فرماتے فرماتے چپ ہوگئے اور رونے لگے۔ ذکیہ اور نقیہ دونوں پر ایسی ہیبت چھائی کہ منہ سے کچھ نہ بول سکیں اور چپ چاپ یہ مجذوبانہ باتیں سنتی رہیں۔ یہاں تک کہ سید صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

غدر

آخر ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر شروع ہوگیا۔ میرٹھ کی فوج باغی ہو کر دلی میں آئی اور وہ آفت چھائی کہ سب معاملات زیر و زبر ہوگئے۔ ذکیہ اور اس کے والد تہور خان کی مسجد کے پاس ایک مکان میں جو دلی کے معمولی مکانوں کا نمونہ تھا' رہتے تھے۔ غدر شروع ہوا تو سید نور الہدیٰ نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے دوبارہ دلی پر تسلط حاصل کر لیا۔ باغی بھاگ گئے۔ بہادر شاہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہوئے اور گرفتار کیے گئے۔

شہر کی لوٹ اور گرفتاریوں کے زمانہ میں بھی سید صاحب گھر سے نہ نکلے۔ آخر ایک فوجی جمعیت ان کے گھر میں گھسی اور سید صاحب کو گرفتار کر لیا۔ اسباب لٹ گیا۔ فوج کا افسر انگریز تھا۔ اس نے کہا "کیا تم ہی سید نور الہدیٰ ہو؟ اور تم ہی نے افواج کے فلاں فلاں سرداروں کو خط لکھے تھے کہ انگریزوں کا قتل عام لوح محفوظ پر میں نے لکھا دیکھا ہے۔"

سید صاحب نے کہا "ہاں میں وہی نور الہدیٰ ہوں۔" افسر نے تعجب کے لہجے میں کہا "تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو؟" سید صاحب نے کہا "اپنی تحریر کا مجھ کو اقرار ہے۔ جرم کا اقرار نہیں ہے۔" انگریز بولا "کیا تم اس کو جرم نہیں سمجھتے کہ جاہلوں کو ایک جھوٹی بات لکھ کر قتل عام پر راغب کیا۔" سید صاحب نے اس کا جواب کچھ نہ دیا اور آسمان کو دیکھ کر

چننے لگے۔ان کو ہنستا دیکھ کر انگریز افسر کو غصہ آیا اور اس نے ایک سنگین ان کے ہونٹوں پر ماری جس سے ان کا جبڑا کٹ گیا اور خون داڑھی پر بہنے لگا۔ذکیہ یہ دیکھ کر چیخی "ہائے میرے ابو۔" سید صاحب نے زخم کھا کر بھی گھبراہٹ ظاہر نہ کی اور پھر آسمان کو دیکھا اور خون اپنے چہرے اور سینہ پر ملنے لگے۔یہ دیکھ کر افسر نے اشارہ کیا اور ایک سپاہی نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ سید صاحب دو ٹکڑے ہو کر گر پڑے۔

اس کے بعد فوج باہر چلی گئی اور عورتوں سے کچھ تعرض نہ کیا۔ذکیہ اور نقیہ نے یہ عالم دیکھ کر پہلے تو بہت نوحہ و بکا کیا۔اس کے بعد شہید کی میت دفن کرانے کا سامان کرنے لگیں' مگر دہلی میں اس وقت کوئی نہ تھا جو ان کی مدد کو آتا۔آخر انہوں نے خود ہی لاش کو انہی خون بھرے کپڑوں میں مکان کے صحن کو کھود کر دفن کر دیا۔

گھر کا سب سامان لٹ گیا تھا' لیکن آٹا دال لکڑیاں موجود تھیں۔انہوں نے چند روز ان سے بسر اوقات کی اور جب یہ ختم ہو گئیں تو کھانے کا فکر ہوا۔

اس وقت شہر میں امی جی (امن) کا اعلان ہو چکا تھا اور بھاگے ہوئے آدمی آ آ کر آباد ہو رہے تھے۔ذکیہ نے اپنی والدہ سے صلاح لے کر حاکم دہلی کے نام ایک خط لکھنے کی ٹھہرائی تا کہ اس سے کچھ امداد حاصل ہو۔نقیہ نے کہا "خط تو لکھ لو گی مگر اس کو پہنچائے گا کون۔" ذکیہ نے کہا "پڑوس میں جو عامل صاحب رہتے ہیں' سنا ہے وہ غدر میں نہیں بھاگے اور سرکار کے بڑے خیر خواہ ہیں۔تم ان کے پاس جا کر یہ خط کسی طرح پہنچا دو۔" نقیہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور خط لے کر عامل کے پاس گئی۔عامل ایک نوجوان آدمی تھا اور گھر کی حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ عامل بہت خوش حال ہے۔

نقیہ نے برقع کے اندر سے عامل کو اپنی کیفیت سنائی۔عامل نے بہت ہمدردی ظاہر کر کے کہا "حاکم دہلی سے مدد کی امید نہ رکھو۔سید صاحب کا نام بڑے باغیوں میں درج ہے اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے فوج کو بھڑکانے میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا۔اگر تم قبول کرو تو میں خود کچھ حاضر کر دیا کروں گا۔" نقیہ نے کہا "ہم مفت خیرات کسی سے نہیں لے سکتے۔ تمہارا کچھ کام ہو تو اس کے بدلے جو دو گے' لے لیں گے۔" عامل نے کہا "ہاں اپنی لڑکی سے کہو کہ وہ میری کتابوں کی ایک فہرست بنا دے اور پراگندہ اوراق کو ایک جگہ کر دے۔اس کے عوض میں تم کو دونوں وقت پکا پکایا کھانا اور اوپر کا سب خرچ دیا کروں گا۔"

نقیہ نے گھر آ کر ذکیہ سے یہ حال کہا اور اس نے اس نوکری کو قبول کر لیا۔عامل نے ایک کمرہ بتا دیا جہاں کتابیں تھیں اور ذکیہ و نقیہ صبح سے شام تک وہاں کام کرنے لگیں۔

ردی میں ایک خط

ذکیہ کاغذوں کو درست کر رہی تھی کہ اس کو ایک خط ردی کاغذوں میں ملا ہوا دستیاب ہوا' جس کا مضمون یہ تھا:

عامل صاحب کا تعویذ پہنچ گیا۔ہم ہدایت کے موافق کام کرنے کو تیار ہیں۔دھونی پنجاب سے آ گئی ہے۔سید نور الہدیٰ صاحب بزرگ کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے' معلوم ہوا۔ہم عنقریب ان کی زیارت کو آئیں گے اور ان کی کرامات کے مطابق ان کو نذر دیں گے۔ہم کو اوپری تکلیف بہت ہے۔کیا آپ اس کے اتار کی کوئی ترکیب بتا سکتے

ہیں۔ پہلے آپ نے کشمیر کے عامل کا پتہ بتایا تھا۔ اب ہم سب کی صلاح کشمیر کی ہوگئی ہے۔

راقم آپ کا معتقد (ن۔ن)

ذکیہ اس خط کو پڑھ کر حیران رہ گئی اور اس نے بہت غور کے بعد سمجھا کہ یہ خط جنرل نکلسن کا ہے' جو حملہ دہلی کے وقت پہاڑی پر تھا۔ تعویذ سے مراد خفیہ اطلاع ہے جو عامل نے بھیجی ہوگی۔ پنجاب کی دعوتی سے مطلب فوج وتوپخانہ ہے جو تعویذ کی رعایت سے ایک اصطلاح بنائی گئی ہے۔ اوپری تکلیف کا مطلب پہاڑی کے مورچوں کی تکلیف ہے اور اتار کا مقصد یہ ہے کہ دہلی میں داخل ہونے کی ترکیب بتایئے۔ کشمیر کے عامل سے مراد کشمیری دروازہ ہے جہاں سے فتح دہلی کے وقت حملہ ہوا اور سید نور الہدیٰ کی نذران کا قتل ہے۔ ذکیہ سمجھ گئی کہ ن۔ن سے مراد جنرل نکلسن ہے اور میرے باپ کی مخبری اسی عامل نے کی تھی۔ یہ خیال کر کے ذکیہ کی آنکھوں میں زمین و آسمان تاریک ہو گئے اور اس نے عامل سے اپنے باپ کا بدلہ لینے کی دل میں ٹھان لی۔

چنانچہ دوسرے دن رات کو وہ چھری لے کر عامل کے مکان میں گئی تاکہ سوتے میں اس کا کام تمام کر دے' مگر اس نے جا کر دیکھا کہ عامل خواب گاہ میں نہیں ہے تو وہ مایوس ہو کر گھر واپس آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کی لاش خون میں غلطاں پڑی ہے اور سرہانے ایک خط رکھا ہے جس پر لکھا ہے۔

''ذکیہ تیرے ارادہ کا بدلہ اور اپنے رقیب کا انجام۔ تیری ماں مار ڈالی گئی کہ وہ مجھ کو تجھ تک پہنچنے میں سدراہ تھی۔ آج تو نے میرے مارنے کا ارادہ کیا تو میں نے اس کو قتل کر دیا۔ اب خط پڑھ چک کر تو دہلی سے باہر جانے والی ہے۔''

آخری فقرہ کو پڑھ کر ذکیہ ماں کا صدمہ بھول گئی اور چاہتی تھی کہ غل مچائے اور محلہ والوں کو مدد کے لیے پکارے کہ کسی نے دوڑ کر اس کا منہ بند کر لیا۔

انبالہ

ذکیہ کا منہ بند کیا گیا۔ آنکھیں بند کی گئیں۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں اس کے حواس بھی بند ہو گئے اور اس کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ ایک اجنبی مکان میں ہے اور عامل سامنے بیٹھا ہے اور کہتا ہے تم انبالہ میں ہو۔ میں انگریزوں کی پناہ میں آ گیا ہوں۔ اب تو تم کو باپ کا بدلہ لینے کی ہوس نہیں ہے؟ ذکیہ نے کہا'' میں سید ہوں۔ شرم کرو اور نامحرم ہو کر سامنے نہ آؤ۔'' عامل نے کہا'' ابھی نکاح ہو جائے گا اور محرم بن جاؤں گا۔'' ذکیہ نے اپنے منہ کو ہاتھوں سے چھپا لیا اور اپنے انجام و بے بسی پر غور کرنے لگی۔

خون

ذکیہ نے چہرہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ یکایک اس کو ایک زبردست آہٹ کی آواز آئی اور کسی نے گالی دے کر عامل کے سر پر کچھ مارا۔ ذکیہ نے منہ کھول دیا اور دیکھا عامل کے نوکر نے لٹھ مار کر عامل کو قتل کر دیا ہے اور ذکیہ سے کہتا ہے ''جلدی بھاگو۔ میں تم کو بچانے آیا ہوں۔'' ذکیہ اس کے ساتھ اٹھ کر بھاگی۔ باہر ایک رتھ کھڑا تھا۔ اس میں سوار ہو کر قافل

نوکر کے ساتھ چلی گئی۔

کرنال

نوکر ذکیہ کو لے کر کرنال آیا' جہاں اس کا گھر تھا اور ذکیہ کو اپنی ماں کے پاس اتار دیا اور بولا "بی بی! تم سیدانی ہو۔ اس ظالم عامل کی نوکری میں میں نے یہ سنا اور اس کے برے ارادوں کو معلوم کر کے مار ڈالنا ثواب جانا۔ اب دعا کرو کہ گرفتار نہ ہوں۔" یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ باہر پولیس نے اس کو آواز دی۔ نوکر نے کہا "لو قضا آ گئی۔ اماں خدا حافظ۔ اس عورت کی خبر رکھنا۔ میں بھاگتا ہوں۔ جی بچا تو کبھی آ جاؤں گا ورنہ آخری سلام ہے۔" یہ کہہ کر دوسرے دروازے سے نکل کر باہر چلا گیا۔ پولیس تین آوازیں دے کر اندر داخل ہو گئی اور جب اس نے دوسرے دروازے کا حال معلوم کیا تو قدموں کے نشانوں پر باہر چلی گئی' مگر ہر چند تلاش کیا' قاتل نوکر کا سراغ پولیس کو نہ چلا۔

آخر سرکار نے نوکر کے گھر کی ضبطی کا حکم صادر کیا اور سارا سامان نیلام ہو گیا۔ نوکر کی ماں گھر سے نکل کر اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں چلی گئی اور ذکیہ کو ساتھ لیتی گئی' مگر اس رشتہ دار نے ان کو اپنے ہاں ٹھہرانے سے انکار کیا اور کہا "تم سرکاری مجرم سے تعلق رکھتی ہو۔ میں تم کو اپنے ہاں نہیں ٹھہرا سکتا۔" نوکر کی ماں نے اپنے سب رشتہ داروں اور بیٹے کے دوستوں کے گھر دیکھ لئے' مگر کسی نے ان کو پناہ نہ دی تو مجبور ہو کر بڑھیا نے ذکیہ سے کہا "اب چلو مسجد میں چلو کہ وہ خدا کا گھر ہے۔ وہاں تو امن ملے گا"، مگر جب یہ مسجد میں گئی تو مُلّا نے کہا "یہاں عورتوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔" ذکیہ نے کہا "ہم بیکس ہیں۔ ہم مظلوم ہیں۔ ہم بے وارث ہیں۔ ہمارے سب سہارے ٹوٹ گئے۔ اس واسطے خدا کے دروازے پر آسرا ڈھونڈنے آئے ہیں۔ ہم کو نہ نکال کہ ہمارا اب کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔ ہم کہاں جائیں کہ کوئی ہم کو اپنے گھر میں نہیں آنے دیتا۔ خدا سے ڈر اور لاوارثوں کو دھکے نہ دے۔"

مُلّا نے ہنس کر کہا "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ سرائے نہیں ہے جس میں تم ٹھہرو۔ خیر اسی میں ہے کہ خود نکل جاؤ ورنہ چٹیا پکڑ کر نکال دوں گا۔" بڑھیا نے رو کر کہا "یہ سیدانی ہے' اس کی بے حرمتی نہ کر اور ایسے الفاظ منہ سے نہ نکال۔" مُلّا نے کہا "ایسی بہت سی سیدانیاں دیکھی ہیں۔ باتیں نہ بناؤ اور یہاں سے جاؤ۔" یہ کہہ کر مُلّا نے دونوں کو دھکے دے دیئے جس کے صدمہ سے بیچاری بڑھیا مسجد کے دروازے کے باہر اوندھے منہ گر پڑی۔ اس کے رہے سہے دو دانت بھی ٹوٹ گئے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ بیہوش ہو گئی۔ ذکیہ نے بڑھیا کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اپنے دوپٹہ سے اس کے منہ کا خون پونچھا اور کہا "اماں! ہوشیار ہو گھبراؤ نہیں۔ خدا ہماری مدد کرے گا۔" بڑھیا نے بڑی ناتواں اور دھیمی آواز میں جواب دیا "ہاں بیٹی! خدا ہی مددگار ہے۔ میرے سینے پر بہت چوٹ لگی ہے۔ میرا سانس رکا جاتا ہے۔ میں بیمار تو مدت سے تھی' اس پر بیٹے کی جدائی' گھر کی تباہی اور اس دربدری رسوائی کا صدمہ۔ مُلّا نے اس زور سے دھکا دیا ہے اور میں ایسی گری ہوں کہ اب زندگی کی امید نہیں معلوم ہوتی۔ میرے دل پر چوٹ لگی ......" یہ کہتے کہتے بڑھیا کو اُبکائی آئی اور اس نے خون کی قے کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کے پھیپھڑے پر شدید ضرب آئی ہے۔ خون کی قے کرتے ہی بڑھیا کا ہوش گم ہونے لگا اور ذکیہ بھی گھبرا گئی۔

بڑھیا نے کہا "اے مُلا! تو نے میری جان ناحق لی۔ میں اس بے وارث سیدانی کو لے کر آئی تھی۔ میں مرتی ہوں۔ اپنے رسولؐ کے پاس جاؤں گی۔ بی بی فاطمہؓ کے قدموں میں سر جھکاؤں گی اور کہوں گی کہ تمہاری ایک بچی پر جوان بیٹے کو قربانی چڑھایا اور خود بھی فدا ہو گئی۔ بی بی فاطمہ مجھ کو گلے لگالیں گی۔ رسول خداؐ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے کوثر کا جام مجھ کو دلوائیں گے۔ آہ دم چلا۔"

اور پھر ایکائی آئی۔ بڑھیا نے پھرتے کی اور جیتا جیتا لال خون اس میں آیا۔ اس نے بڑھیا کا کام تمام کر دیا اور ایک ہی ہچکی لے کر اس نے جان دے دی۔

اس وقت عجیب منظر تھا۔ ذکیہ لاش کو سنبھالے مسجد کے دروازے کے آگے شارع عام پر بیٹھی تھی اور کسی پرسان حال کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈھونڈتی تھی۔ مگر اس وقت کوئی راہ گیر بھی نہ آتا تھا' جو ان بیکسوں کی بات پوچھتا۔ مُلا نے مسجد کا دروازہ بند کر لیا تھا۔

آخر ذکیہ نے مایوس ہو کر آسمان کو دیکھا اور کہا "اے خدا! میں تیرے پیارے رسول کا خون ہوں۔ میری سن اور مجھ کو اس امتحان میں نہ ڈال۔"

یکایک ایک فقیر اُدھر سے گذرا اور اس نے جو یہ حالت دیکھی تو محلے والوں کے پاس جا کر خبر دی اور انہوں نے جمع ہو کر ذکیہ کا حال پوچھا۔ ذکیہ نے مُلا کی شکایت نہ کی اور محلہ والوں سے بڑھیا کی تجہیز و تکفین کا سامان کرنے کو کہا' چنانچہ تھوڑی دیر میں بندوبست ہو گیا اور ذکیہ بھی میت کے ساتھ قبرستان تک گئی۔ دفن سے فارغ ہو کر اس نے دیکھا کہ جو فقیر مسجد کے سامنے ملا تھا' اس کی جھونپڑی اسی قبرستان میں ہے۔ فقیر بہت بڈھا آدمی تھا' ذکیہ اس کے پاس گئی اور کہا "بابا مجھے بھی تھوڑی سی جگہ اپنے پاس دو۔" فقیر نے کہا "بیٹی تیرا گھر ہے۔ شوق سے رہ۔"

یہ فقیر روزانہ بھیک مانگنے جاتا تھا اور روٹیاں ٹکڑے نقدی وغیرہ جمع کر کے لاتا تھا۔ جس میں خود بھی کھاتا اور ذکیہ کو بھی کھلاتا۔

ذکیہ بھیک مانگتی ہے

چند روز کے بعد فقیر بیمار ہو گیا' تو اس نے ذکیہ سے کہا "بیٹی! اب تو شہر میں جا اور بھیک مانگ کر لا۔" ذکیہ نے دل میں خیال کیا۔ "میں سیدانی ہوں اور مجھ کو بھیک جائز نہیں ہے" مگر اس نے سوچا کہ جب بھیک کے ٹکڑے کھا چکی ہوں تو مانگنے میں کیا شرم ہے۔ مجبوری انسان سے سب کچھ کراتی ہے' چنانچہ برقعہ پہن جھولی ہاتھ میں لے شہر میں چلی گئی۔ جب وہ ایک محلہ میں گئی تو اس نے یہ صدا لگائی۔

"یہ دنیا ناگ پھنی کا پھول ہے۔ جو اس کو چاہے اس کی بڑی بھول ہے۔ دو سانس کی زندگی پر کیوں اتراتا ہے۔ یاد رکھ مرنے کا وقت سامنے چلا آتا ہے۔ غفلت میں کیوں سوتا ہے اور وقت کی دولت کھوتا ہے۔ اٹھ باندھ کر چل منزل کو اور دیکھ خدا کی محفل کو۔ روٹی کا نوالہ سالن میں ڈوب کر گل جاتا ہے۔ دل بھی طمع میں گر کر شل ہو جاتا ہے۔ آگ کا شعلہ چولہے کے اندر بھی بجھ جاتا ہے۔ دیکھو خود پرست انگارا کھو ہو جاتا ہے۔ رزقکم فی السماء کی رٹ ہے اسی

رحمت سے سوال ہے۔ بندہ کیا دے گا۔ دینے والا وہ ذوالجلال ہے۔"

ذکیہ کی اس صدا کی دھوم مچ گئی۔ محلہ کے پڑھے لکھے آدمی اس کے آس پاس جمع ہو گئے اور روٹیاں لا لا کر اس کی جھولی میں ڈالنے لگے۔ کسی نے کہا بی بی سامنے والے مکان میں جاؤ۔ وہاں آج محرم کی مجلس ہے۔ مجتہد صاحب وعظ کر چکیں گے تو فقراء کو کھانا تقسیم ہوگا۔ ذکیہ مجلس میں چلی گئی' تو اس نے دیکھا ہزاروں آدمی جمع ہیں اور مجتہد صاحب آل محمدؐ کے فضائل اور ان کی خدمت ومحبت کی بڑائیاں بیان کر رہے ہیں۔ آخر میں انہوں نے کہا" کاش کہ ہم لوگ کربلا میں ہوتے اور اپنے جان ومال کو اہل بیت پر نثار کرتے یا بعد کے اماموں کا زمانہ ہی ہم کو ملتا اور ان کی مصیبتوں کے وقت ہماری جانیں قربان ہوتیں۔ ہم آل محمدؐ کے غلام ہیں۔ ہم آل محمدؐ کے فدائی ہیں۔ ہماری ساری زندگی ان کے قدموں کے نیچے بچھی ہوئی ہے۔ آج یہ تمام کر و فر' یہ سب دھوم دھام آل رسولؐ کی خاطر ہے۔ آج تمام دنیا میں اس وقت لاکھوں مقام پر آل محمدؐ کی یاد میں مجلسیں ہو رہی ہوں گی۔"

ذکیہ نے مجتہد صاحب کی یہ تقریر سنی تو بلند آواز سے کہا" سنئے سنئے مجھے کچھ کہنا ہے۔" خلقت نے ذکیہ کو روکا اور بگڑ کر کہا کہ" بے ادبی نہ کر اور چپکی رہ۔ قبلہ وکعبہ کے کلام کو پورا ہو جانے دے۔" مجتہد صاحب کے چہرہ پر بھی بل پڑ گیا اور انہوں نے فرمایا" کیسی بے تمیز عورت ہے۔" ذکیہ نے کہا" خفا نہ ہو۔ اب تمہارا بیان ہو چکا۔ اب اس کا بیان سنو جس کی مدد ونصرت کے لیے ٹھنڈے سانس بھر رہے تھے۔ میں امام ہشتم کی نشانی ہوں۔ اگر یہ زمانے کی ستائی ہوئی بھکارن بے گھری' بے دری' ذکیہ بیابانی ہوں۔" ذکیہ کی اس تقریر میں ایسا درد تھا کہ مجمع پر سناٹا چھا گیا اور مجتہد صاحب سمیت سب لوگ حیرت سے اس کی بات سننے لگے۔ ذکیہ نے سب کو مخاطب پا کر یہ تقریر کی۔

" مجتہد صاحب اور جلسہ والوں کو معلوم ہو کہ حسینؓ اور ان کی اولاد اب بھی کربلا کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ حسینی باغ کے پھول آج بھی ستم کی دھوپ میں کملا رہے ہیں۔ اس دنیا کی ہر گلی میں بی بی فاطمہؓ کی اولاد خستہ حال ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ سیدوں پر آج بھی یزیدی مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ تم لوگ کیوں جھوٹی آہیں بھرتے ہو۔ اگر تم کربلا کے وقت موجود ہوتے تو اسی طرح آل محمدؐ سے بے خبر رہتے جیسے آج ہو۔ اگر تم پاک اور معصوم اماموں کا زمانہ پاتے تب بھی آج کی طرح خود غرض نظر آتے اور تم میں کا ایک بھی ان کی مدد نہ کرتا۔

" اے مجتہد صاحب! تم اور تمہاری طرح سب پیشوا لوگ ہمارا نام لے کر روٹی کھاتے ہو عزت پاتے ہو۔ محبان اہل بیت مومنین پر حکومت کرتے ہو' مگر تم میں سے ایک کو بھی بی فاطمہؓ کی پریشان حال لونڈی سے ہمدردی نہیں ہے۔ ان مجلسوں کی دھوم دھام سے تمہارا مقصد دنیا کی ناموری ہے۔ آل محمدؐ کی خدمت نہیں ہے۔ یہ مٹھائیاں اور کھانے ہماری الفت میں تقسیم نہیں کیے جاتے۔ ان میں تو تمہاری دولت کی نمود ہے اور دکھاوے کے خیالات ہیں۔ ہمارے نام کی محبت اور ہمارے کام کی فدائیت کے خیال سے مومنین تم کو گھر کی دولتیں بخش دیتے ہیں اور تم ان کو ذاتی عیش وآرام میں اڑاتے ہو۔ عمدہ کپڑے' عمدہ کھانے' عمدہ مکان' عمدہ سواریاں' عمدہ نوکر رکھتے ہو اور آل محمدؐ کی بھوک پیاس میں ایک پیسہ تمہاری جیب سے نہیں نکلتا۔ بتاؤ بتاؤ آج کے دن جو لاکھوں مجلسیں ہو رہی ہیں اور ان میں کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے' وہ آل محمدؐ زندہ اور موجود بی فاطمہؓ کے حصے میں کتنا آتا ہے۔ کتنے سادات کی فاقہ کشی دور کرائی جاتی ہے۔ کتنے اہل بیت کے بچوں کی

تعلیم وتربیت میں خرچ ہوتا ہے۔ کس قدر سیدوں اور محتاج وبیکس سیدانیوں کی خبر گیری کی جاتی ہے۔ چپ کیوں ہو۔ بولو۔ جواب دو۔ کیا بول سکتے ہو؟ کیا جواب دے سکتے ہو؟ کہ تمہارے دل نادم ہیں اور میری کھری بات نے تم کو شرمندہ کردیا ہے۔

''مجتہد صاحب! توبہ کرو اور دنیا بھر کے مجتہدوں اور ان لوگوں کو پیام دو جو آل محمدؐ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور محبان آل محمدؐ کی سرداریاں کررہے ہیں کہ قیامت کے دن رسول خداؐ تم سے ان جھوٹے وعدوں کی نسبت جواب طلب کریں گے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ اور سیدہ مظلومہ بی بی فاطمہؑ دریافت فرمائیں گے کہ تم نے ہماری اولاد کے ساتھ عملی محبت بھی ظاہر کی؟ یا محض زبانی باتیں بناتے رہے۔''

ذکیہ کی اس تقریر سے سب لوگ ششدر رہ گئے اور کسی کو جرأت بولنے کی نہ ہوئی۔ اس کے بعد ذکیہ چپکے سے نکل کر قبرستان میں چلی گئی۔

کچھ دن کے بعد ذکیہ نے ایک شریف مزاج سید سے نکاح کرلیا۔ وہ سید کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور ذکیہ کے اصرار سے قبرستان ہی میں انہوں نے مکان بنالیا' جہاں ذکیہ ساری عمر رہی۔ ذکیہ جمعہ کے دن قبرستان میں مسلمانوں کے سامنے دنیا کے انجام عبرت پر وعظ کہا کرتی تھی اور ہزاروں آدمی اس کی نصیحت آمیز پُر اثر تقریر سننے آتے تھے اور اس کا نام سب لوگوں میں ذکیہ بیابانی مشہور ہوگیا تھا' جواب بھی کہیں کہیں اسی نام سے مشہور ہے۔

ذکیہ نے جو کچھ مجتہد صاحب سے کہا' اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہئے۔ ہز ہائنس سر آغا خان صاحب اور بوہروں کے ملا طاہر سیف الدین صاحب اور تمام مجتہدین وعلماء ومشائخ کو جو بی بی فاطمہؑ کا نام لے کر اور مجلسوں کو گرما کرامت کے بزرگ اور مقتدا بن گئے ہیں' مگر آل محمدؐ کی ہمدردی ان کو کچھ نہیں ہے' سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنے اپنے فرقہ اور گروہ بنالئے ہیں اور آل محمدؐ کے نام سے بے شمار روپیہ وصول کرکے شاہانہ کرّ وفر سے اوقات بسر کررہے ہیں۔ میں ان کو پھر جگاتا ہوں اور جھنجوڑتا ہوں' جس طرح کہ دو سال پہلے اپنی کتاب ''یزید نامہ'' میں نام لے لے کر جگاتا تھا' مگر دو برس میں بھی آج تک کوئی بیدار نہ ہوا۔

☆ ☆ ☆

دو شہزادے جیل خانے میں

میرزا تیغ جمال کی عمر اب اسّی برس کی ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں وہ انیس برس کے کم و جوان تھے اور ان کو غدر سے پہلے کی باتیں ایسی یاد ہیں جیسے ابھی کل کی گذری ہوئی حالت کو بیان کیا کرتے ہیں۔

تیغ جمال میرزا فخرو ولی عہد دوم کے لڑکے ہیں۔ میرزا دارا بخت بہادر شاہ کے پہلے ولی عہد تھے' لیکن جب ان کا انتقال ہوگیا تو میرزا فخرو ولی عہد قرار پائے۔

میرزا فخرو بہت دین دار اور متقی شہزادے تھے۔ اگر دلی کا تخت باقی رہتا تو یہ ہندوستان کے بہت ہی نیک بادشاہ

مانے جاتے' مگر جوانی کے دیوانہ پن میں بڑے بڑے پارساؤں کا قدم ڈگمگا جاتا ہے۔ میرزا فخرو تو پھر بادشاہ ہند کے بیٹے اور ولی عہد تھے جن کو شباب کی آنکھ مچولیاں کرنے میں کسی کا خوف و لحاظ نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں لال قلعہ خانگی بدچلنی میں اس قدر بدنام تھا جس کی کچھ حد نہیں۔ پھر اگر مرزا فخرو سے کوئی غلطی ہوگئی اور وہ جوش شباب کی مستی کو روک نہ سکے تو کچھ زیادہ گرفت کے قابل نہیں سمجھا جائے گا۔ میرزا تیغ جمال اسی پہلی اور خفیہ مگر نہایت دلچسپ غلطی کا نتیجہ ہے۔ ان کے بعد ان کی والدہ سے پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی اور میرزا فخرو کی دوسری اولاد میرزا فرخندہ جمال وغیرہ ان کی نکاحتہ بیوی سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے بڑی پنشن کا حقدار میرزا فرخندہ جمال کو قرار دیا' جن کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملتا ہے اور تیغ جمال کو پانچ روپے پنشن بھی نہ ملی۔

تیغ جمال عجب زندہ دل اور خوش طبع شہزادے ہیں۔ ان کو پنشن نہ ملنے اور شہزادہ مشہور نہ ہونے کا ذرا بھی غم نہیں اور وہ اپنے والدین کے خفیہ تعلقات کو اس لطف سے بیان کرتے ہیں گویا ان کا اس عشق بازی کے نتیجہ سے کچھ ذاتی واسطہ ہی نہیں ہے' حالانکہ وہ اس چھپی ہوئی اور لال قلعہ کی بیگمات میں نہایت مبالغہ آمیز کیفیات کے ساتھ مشہور عشق بازی کا بولتا ہوا حاصل مقصد ہیں۔

تیغ جمال کہتے ہیں "اماں جان کی عمر سولہ برس کی تھی اور ابا جان تیرہ برس سے کچھ مہینے زیادہ کا سن رکھتے تھے' جب یہ عشق بازی شروع ہوئی تھی۔ پوچھا جائے کہ جناب تیرہ برس کا بچہ سولہ برس کی عورت سے کیونکر محبت کر سکتا ہے تو سنجیدہ صورت بنا کر کہہ دیتے ہیں جس طرح اسی برس کا بڈھا سولہ برس کی کم سن عورت سے محبت کا دم بھرا کرتا ہے۔

ہم مغلوں میں بچے بہت جلدی جوان ہو جاتے تھے۔ لڑکیاں تو بعض اوقات دس اور گیارہ سال کی عمر میں نمودِ شباب کا اعلان کر دیتی تھیں اور لڑکے بھی بارہ تیرہ برس کے سن میں عشق و محبت اور اس کے نتائج پر غور و عمل کرنے لگتے تھے۔ میں خود بارہ برس کا تھا تو آج کل کے اٹھارہ سالہ جوانوں سے زیادہ جذبات اپنے اندر پاتا تھا۔"

تیغ جمال نے کہا "اماں جان ایک کہار کی لڑکی تھیں۔ نانی اماں کو محل کی کہاریوں میں سب سے دیدارو کہاری کہا جاتا تھا' جو حضرت اکبر شاہ ثانی کی نظر کردہ تھیں' مگر جو حسن اور جو غمزہ ہائے جاں ستان اماں جان رکھتی تھیں' وہ نانی اماں کے خواب و خیال میں بھی نہ گذرے ہوں گے۔

"ہونے کو تو اماں جان بھی محل شاہی کی نوکر تھیں' مگر ان کا قیام اکثر خانم کے بازار میں رہتا تھا۔ جہاں نانی اماں نانا ابا اور ہماری ننھیال کے سب کہار رہتے تھے۔

"ایک دن کا ذکر ہے کہ ابا جان ڈیوڑھی کے داروغہ کے ساتھ اپنی کمان درست کرانے خانم کے بازار چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کہیں اماں جان کو دیکھ لیا اور اسی وقت ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ گھر آئے تو اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گئے اور رونا شروع کیا۔ ہر چند لوگ پوچھتے تھے کہ میاں مزاج کیسا ہے۔ دادی اماں کہتی تھیں۔ بیٹا کسی نے کچھ کہا ہو۔ بتا ہو۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں اس کا تدارک کروں' مگر یہ تو عشق کے ستائے ہوئے تھے۔ ایک بات منہ سے نہ کہتے تھے اور چپ چاپ پڑے روتے تھے۔

"آخر رفتہ رفتہ یہ بات کھل گئی اور محل میں اس کے مذاق اور چرچے ہونے لگے۔ بیگمات ابا جان کو چھیڑنے لگیں

اور ہم سن لڑکوں میں بھی اشارہ بازیاں اور آوازہ کشیاں شروع ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ نانی اماں کو خبر ہوئی تو انہوں نے اماں جان کو محل میں بلا لیا اور دادی اماں کی ڈیوڑھی پر حاضری لکھوادی' مگر ابا جان کی حالت یہ تھی کہ باوجود اس سرانجام خاص کے وہ اماں جان سے بات کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اماں جان کبھی اکیلے دُکیلے مل جاتیں تو ہنس کر ابا جان کا ہاتھ پکڑ لیتیں اور کہتیں صاحب عالم آپ غمگین کیوں رہتے ہیں' تو ابا جان ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتے اور اماں جان کی طرف مخاطب نہ ہوتے۔

''بظاہر تو یہ حالات تھے۔ اندر کی خبر نہیں' کیا ہوا اور میرزا تیغ جمال کیونکر پیدا ہو گئے۔ میرزا تیغ جمال کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش کے وقت اماں سترہ برس کی اور ابا چودہ ساڑھے چودہ سال کے تھے۔

''دادی اماں نے بہت چاہا کہ اب اس کہاری کے ہاں میرا پوتا پیدا ہو گیا ہے۔ یہ محل میں بیگمات کی طرح رہے' مگر نانی اماں نے اس کو قبول نہ کیا اور اماں جان پھر وہیں خانم کے بازار میں رہنے لگیں۔ میرزا تیغ جمال جب چھ برس کے ہوئے تب وہ لال قلعہ میں اپنے باپ کے پاس آ کر رہے' وہ کہتے ہیں:

''بھائی ہم کہار ہیں ننھیال کی طرف سے اور بادشاہ ہیں ددھیال کے رشتہ سے۔ وہاں بھی انسانوں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور یہاں بھی۔ ہماری برابری کون اس دنیا میں کر سکتا ہے کہ ہماری زندگی خدا کے بندوں کے بوجھ اٹھانے اور خدمت خلق کرنے میں بسر ہوتی ہے۔''

غدر کے بیس برس بعد

میرزا تیغ جمال کہتے ہیں' غدر کے ایام میں اپنی والدہ کے ساتھ دہلی سے بھاگ کر ہم شاہجہاں پور چلے گئے تھے' جہاں ہماری ننھیال کا قدیمی کنبہ رہتا تھا۔ قلعہ کی افراتفری دیکھ کر میں نے شہزادوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اماں کے پاس چلا گیا' کیونکہ شہزادوں کی زندگی اس زمانہ میں دو کوڑی کے برابر بھی نہ تھی۔ مجھ کو جان کی خیر اسی میں نظر آئی کہ کہاروں میں جا کر رہوں اور کہار کہلاؤں۔''

وہ کہتے ہیں کہ ''اماں جان کے پاس اتنی دولت تھی کہ ہم نے شاہجہاں پور میں جا کر ایک دکان کر لی اور بیس برس بڑے عیش و آرام سے گزرے۔

میں حلوائی کی دکان کرتا تھا۔ ایک دن کسی پٹھان نے مٹھائی کی خرابی بیان کر کے مجھ کو گالی دی۔ میں شاہی خون کا مثل۔ گالی کی برداشت کیوں کر کرتا۔ لوہے کا کھچہ اٹھا کر پٹھان صاحب کے مارا جس سے وہ چکرا کر گر پڑے اور پانچ منٹ کے اندر تڑپ کر مر گئے۔

میں پکڑا گیا اور مدتوں مقدمہ اور حوالات کا جھمیلہ برداشت کر کے چودہ برس کی قید کا سزاوار بنا۔''

بریلی کا جیل خانہ

''پہلے دن جب میں جیل خانہ کے اندر داخل ہوا تو مجھے ذرا بھی پریشانی اور غم اپنے قید ہونے کا نہ تھا' کیونکہ

شروع سے ہر وقت خوش اور بے فکر رہنے کی عادت تھی اور غم کبھی میرے پاس نہ آنے پاتا تھا۔ قید کا حکم سننے کے بعد بھی خوش رہا اور جب اماں جان ملنے آئیں اور رونے لگیں تو میں نے ہنس کر کہا "اے بی! تم روتی کیوں ہو۔ دکان میں اتنی مٹھائی چھوڑ کر آیا ہوں جو کئی مہینے تک کھاتی رہو گی۔" اماں جان بولیں "بس تجھ کو ہر وقت مسخرہ پن سوجھتا ہے۔ میرا کون وارث ہے جو چودہ برس تک خبر گیری کرے گا۔ میں نے تو تیرے دم کی بدولت اس پردیس میں بیس برس گذار دیئے۔ ورنہ دلی کی سی اس گاؤں میں بات کہاں۔" میں نے جواب دیا "جب ابا جان کا سارا خاندان تباہ ہو گیا اور بڑی حویلیاں خاک میں مل گئیں اور ہمارے شہزادے بھائی تخت سے تختہ پر آ گئے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ چودہ سال کی بات ہی کیا ہے۔ پلک مارتے گذر جائیں گے اور میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ ذرا میری بیوی کا خیال رکھنا۔ اس کا دل تمہاری بدمزاجی سے میلا نہ ہو۔ تم ملکہ کا سا مزاج رکھتی ہو اور وہ بیچاری محض ایک کہاری ہے۔ مہربانی کر کے اس پر شاہانہ مزاج ظاہر نہ کرنا۔" اماں جان یہ گفتگو سن کر ہنسنے لگیں اور یہ کہتی ہوئی چلی گئیں "خبر نہیں تو اتنا بے غیرت اور ڈھیٹ کیوں ہے۔ خیر جا خدا کے سپرد کیا۔"

"جس وقت جیل خانے کے کپڑے پہننے کو دیئے گئے تو میں نے مذاق سے کہا "اس جانگیہ کو رہنے دیجئے۔ مجھ کو اپنا پائجامہ اس سے زیادہ پیارا ہے۔" یہ گفتگو برقنداز جیل کو کب گوارا ہو سکتی تھی۔ اس نے دو تین ڈنڈے رسید کیے اور کہا "یہ تمہاری نانی اماں کا گھر نہیں ہے، جو دل لگی کی باتیں کرتے ہو۔" میں نے ڈنڈے کھا کر بھی ہنسی کا جواب دیا کہ "بھائی! نانی اماں کا گھر خانم بازار میں تھا اور وہ محلہ کے ساتھ کھود کر برابر کر دیا گیا۔ دادی اماں کا گھر لال قلعہ میں تھا۔ اس میں اب گورے رہتے ہیں۔ میں تو اس کو سسرال کا گھر سمجھ کر آیا تھا۔ وہاں جوتیاں تو مارا کرتے ہیں۔ ڈنڈے مارتے کبھی نہیں سنے۔ تم میرے سالے ہو یا سسرے۔"

"برقنداز آگ بگولا ہو گیا اور اس نے دو تین آدمیوں کی امداد سے مجھ کو اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو ایک کوٹھڑی کے اندر لیٹا تھا اور برقنداز سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا "جناب مارنے کا شگون ہو چکا۔ اب اپنی بہن کو یہاں لائیے جو مجھ کو کھانا دے اور ہلدی چونہ چوٹ پر لگائے۔" برقنداز کو بے اختیار ہنسی آ گئی اور اس نے کہا "تم آدمی ہو یا پتھر۔ کسی بات کا تم پر اثر نہیں ہوتا۔ میاں یہ جیل خانہ ہے۔ یہاں یہ خوش مذاقیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ تم کو چودہ برس گذارنے ہیں۔ سیدھے ہو کر رہو گے تو خیر ہے ورنہ پٹتے پٹتے چودہ دن کے اندر مر جاؤ گے۔"

"میں نے کہا "مرنے کے بعد بھی آدمی کو قبر کے جیل خانہ میں جانا پڑتا ہے، مگر مجھ کو مردہ پر بڑا غصہ آتا ہے کہ وہ کیوں چپ چاپ کفن اوڑھ کر قبر میں چلا جاتا ہے۔ میں تو مرنے کے بعد بھی خاموش نہ رہوں گا اور جو شخص میرے پاس رہے گا اس کو بھی ایسا بنا دوں گا کہ اگر وہ مرے تو چپکا نہ رہے بلکہ ہنستا بولتا قبر میں جائے۔ اگر تم کو شک ہو تو تم ابھی مر کر دیکھ لو یا کہو تو میں مار ڈالوں۔"

"برقنداز نے سمجھا یہ کوئی پاگل ہے اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو چکی خانہ میں لے گئے جہاں ایک چکی پر دو آدمی کھڑے ہو کر آٹا پیستے ہیں۔ میری چکی کا شریک ایک بڈھا آدمی تھا اور شاید نیا نیا قید ہو کر آیا تھا۔ اس واسطے زار و قطار رو رہا تھا۔ میں نے پہلے تو جھک کر ایک فرشی سلام اس کو کیا اور اس کے بعد بولا "نانا ابا! آپ روتے کیوں ہیں۔ فدوی ایک دوغلی قسم کا آدمی ہے۔ آدھا تیموری شہزادہ اور آدھا کہار اور جب آپ کے ہمراہ چکی کا کام کرے گا تو

تیسری شاخ میرے اندر راور لگ جائے گی اور وہ یہ کہ پاؤ بسور یہ۔''

''بڑے میاں نے میری بات پر ذرا توجہ نہ کی۔ ان کو اپنی حالت کا اتنا سخت صدمہ تھا کہ آخر مجھ پر بھی اس کا اثر پڑا اور میں نے کہا۔'' آپ بیٹھ جایئے۔ میں اکیلا چکی چلالوں گا اور آپ کے حصے کا بھی پیس ڈالوں گا۔'' ان حضرت نے اس کا بھی جواب نہ دیا اور کھڑے روتے رہے' لیکن جب برقنداز نے ان کی سفید کتری ہوئی ڈاڑھی پکڑ کر ایک طمانچہ مارا اور کہا'' بس رو چکا۔ کام کر'' تو بیچارے نے آسمان کو دیکھا اور بے اختیار چکی چلانے لگے۔ ان کی اس حالت کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اپنی ساری شوخیاں بھول گیا اور ان کے ساتھ چپ چاپ چکی چلانے لگا۔

''کئی روز یہی نوبت رہی۔ میں ہر چند ان سے بات کرتا تھا' مگر وہ جواب نہ دیتے تھے اور روتے رہتے تھے۔ آٹھ دن کے بعد انہوں نے اپنی سرگذشت سنائی۔''

شاہ عالم کے پڑوتے کی داستان

میں میرزا جہانگیر کا بیٹا ہوں جو اکبر ثانی بادشاہ دہلی کے بیٹے شاہ عالم بادشاہ کے پوتے اور بہادر شاہ کے بھائی تھے۔

جب میرے والد میرزا جہانگیر نے سٹین صاحب انگریز کے گولی ماری تو اس قصور کے عوض قید ہو کر الٰہ آباد بھیجے گئے۔ الٰہ آباد میں انہوں نے ایک عقد کر لیا تھا۔ میری والدہ نظر بندی کے افسر پہرہ دار کی لڑکی تھیں۔ نکاح ہونے کے بعد سے لے کر میرے پیدا ہونے تک والد نے میرے نانا اور والدہ کو اتنی دولت دی کہ سات پیڑی کو کفایت کرتی۔ میری دادی اپنے بیٹے کو دہلی سے برابر جواہرات اور اشرفیاں بھیجا کرتی تھیں اور ان کے پاس دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔

میں نے والد کے انتقال کے بعد نانا کے پاس پرورش پائی اور ایسے ناز و نعمت سے پلا کہ شاید دنیا میں کوئی بچہ میری طرح آرام سے نہ ہوگا۔ ہوشیار ہوا تو ہر قسم کی تعلیم مجھ کو دلائی گئی۔ عربی فارسی کی تکمیل کے بعد میں نے کپڑے کی دکان کر لی۔

دن بھر دکان داری' رات کو خدا کی مہربانی سے تھوڑی عبادت و بیداری میں عمر بسر ہوتی تھی۔ چار بچے خدا نے دیے۔ بوڑھی والدہ اب تک زندہ ہیں۔

ایک روز ایک تھانہ دار صاحب کچھ کپڑا خریدنے آئے۔ میں نے عادت کے موافق ایک بات قیمت کی کہہ دی۔ انہوں نے حجت شروع کی تو میں نے کہا'' جناب! میری دکان پر جھوٹ نہیں بولا جاتا۔'' اس پر وہ بدزبان بگڑ کر بولا ''بڑا ایمان دار تجھ جیسے ٹھگ میں نے بہت جیل خانہ میں بھجوا دیے ہیں۔'' میں نے کہا'' تھانہ دار صاحب زبان سنبھال کر بولیے۔ شریفوں کی گفتگو ایسی نہیں ہوا کرتی۔'' اس پر اس کو اتنا غصہ آیا کہ فوراً ایک تھپڑ میرے کلے پر مارا۔ مجھ میں بھی مغلئی خون تھا۔ جواب میں دو تھپڑ میں نے بھی مار دیے۔ سپاہیوں نے مجھ کو پکڑ لیا اور تھانے لے گئے۔ وہاں تھانہ دار نے مجھ کو حوالات میں بند کرا کے میرے گھر کی تلاشی کرائی اور چوری کا کپڑا برآمد کرا کے مقدمہ قائم کر دیا۔ ہر چند میں نے اپنی بے گناہی ظاہر کی اور حکام سے اصلی واقعات کہے' مگر کسی نے نہ سنا اور چھ ماہ قید سخت کا حکم دے دیا۔

میری بیوی اور ضعیف والدہ نے گھر کا سارا اثاثہ فروخت کر کے مقدمہ میں خرچ کر دیا اور وہ بیچاریاں مفلس ہو گئیں، لیکن نتیجہ خاک نہ نکلا اور یہاں جیل خانہ میں آنے کی نوبت آ گئی۔

سب سے زیادہ مجھے والدہ کا صدمہ ہے جو مجھ سے حوالات میں ملنے آئی تھیں اور میری یہ حالت دیکھ کر آہ کا نعرہ مار کر گر پڑیں اور روح پرواز کر گئی۔ اس وقت میرا بڑا لڑکا جس کی عمر بارہ سال کی ہے ان کے ہمراہ تھا۔ وہ گھبرا گیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "ابا! دادی جان مر گئیں۔" میں چاہتا تھا کہ اماں جان کو جھک کر دیکھوں، مگر ظالم داروغہ کے سپاہی مار کر مجھ کو جیل خانہ میں لے آئے اور والدہ کی لاش وہیں پڑی رہ گئی۔ چلتے وقت میں نے اپنے لڑکے کو یہ کہتے سنا:

"ابا جان! ہم کہاں جائیں۔ اب یہ سپاہی ہم کو بھی ماریں گے۔ دادی جان کو کیونکر گھر لے جائیں۔ تم ذرا ٹھہرو ابا جی ابا جی۔"

"میں اس غم میں رات دن گھلا جاتا ہوں۔ خبر نہیں بیوی بچوں پر کیا گذرتی ہوگی اور ظالم تھانہ دار نے اس پر کیسی کیسی زیادتیاں کی ہوں گی۔

"میرزا تیغ جمال نے یہ سن کر ایک قہقہہ لگایا اور کہا یہ دنیا بھی عجب مقام ہے۔ میری تمہاری ایک ہی حالت ہے اور ایک ہی نسل کا تم میں مجھ میں خون ہے، مگر تم غم کے تحت الثریٰ میں پڑے ہو اور میں خوشی کے آسمان میں زندگی بسر کرتا ہوں۔

"واہ وا۔ ایک صورت کا آدمی۔ ایک کھانا، ایک پہننا، ایک طرح سونا، ایک طرح جاگنا مگر کسی کو عادت ترسنے تڑپنے کو دی۔ کسی کو ترسانے تڑپانے والا بنایا۔ کوئی ہر وقت مغموم و رنجیدہ رہتا ہے۔ کوئی صبح سے شام اور شام سے صبح تک سوائے ہنسنے ہنسانے کے کسی غم کے پاس نہیں پھٹکتا۔

"بھائی صاحب قید تم بھی کاٹو گے اور میں بھی کاٹوں گا۔ تم کو یہ زندگی دوبھر اور اجیرن معلوم ہوگی اور میں اس کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاؤں گا اور مرتے دم تک یوں ہی ہشاش بشاش رہوں گا۔"

☆ ☆ ☆

سبز پوش عورت کی لڑائی

دہلی کے وہ بڈھے جو غدر ۱۸۵۷ء میں جوان تھے، عام طور سے روایت بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں انگریزی فوج نے پہاڑی پر مورچے بنائے تھے اور کشمیری دروازہ کے رخ سے دہلی شہر پر گولہ باری کی جاتی تھی ایک بڑھیا مسلمان عورت سبز لباس پہنے ہوئے شہر کے بازاروں میں آتی اور بلند و گرجدار آواز سے کہتی تھی:

"آؤ چلو خدا نے تم کو بہشت میں بلایا ہے"

شہر کی خلقت یہ صدا سن کر جوق در جوق اس کے آس پاس جمع ہو جاتی تھی اور وہ ان سب کو لے کر کشمیری

دروازے پر دھاوا کرتی اور شہر والوں کو صبح سے شام تک خوب لڑاتی تھی۔

بعض لوگ چشم دید قصہ کہتے ہیں کہ اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔ اس کو موت کا کچھ بھی خوف نہ تھا۔ وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔

کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا تھا اور کبھی گھوڑے پر سوار۔ اس کے پاس تلوار، بندوق اور ایک جھنڈا ہوتا تھا۔ بندوق بہت عمدگی سے چلاتی تھی اور جو لوگ اس کے ہمراہ پہاڑی سے مورچہ تک گئے ہیں اُن میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ تلوار چلانے کے فن سے بھی اچھی واقفیت رکھتی تھی اور بار ہا دیکھا گیا کہ اس نے سامنے والی فوج سے دست بدست تیغ زنی کی۔

اس عورت کی جرأت وہمت کو دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا اور وہ بڑھ بڑھ کے حملے کرتے تھے مگر لڑائی سے ناواقف ہونے کے سبب عموماً ان کو بھاگنا پڑتا تھا اور جب وہ بھاگتے تو یہ عورت ان کو بہت روکتی اور آخر مجبور ہو کر خود بھی واپس چلی آتی، مگر واپس آنے کے بعد پھر کسی کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کہاں چلی جاتی ہے اور پھر کہاں سے آتی ہے۔

آخر اسی طرح ایک دن ایسا ہوا کہ وہ جوش میں بھری ہوئی حملہ کرتی، بندوق مارتی، تلوار چلاتی مورچہ تک پہنچ گئی اور وہاں زخمی ہو کر گھوڑے سے گری۔ انگریزی فوج نے اس کو گرفتار کر لیا۔ پھر کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کہاں گئی اور اس کا کیا حشر ہوا۔

غدر کے ایک انگریز افسر کی شہادت

صوبہ دہلی کی گورنمنٹ نے انگریزی کے چند خطوط چھاپے ہیں جو ایام محاصرۂ دہلی میں انگریزی فوج کے افسروں نے لکھے تھے۔ ان خطوط میں ایک خط لفٹنٹ ڈبلیو۔ ایس۔ آر۔ ہڈسن صاحب کا ہے جو انہوں نے دہلی کیمپ سے ۲۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو مسٹر جے گلسن فارسائتھ ڈپٹی کمشنر انبالہ کے نام بھیجا تھا۔ اس خط میں اس مسلمان بڑھیا کی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ خط کا اردو مفہوم یہ ہے:

''مائی ڈیئر فارسائتھ۔ میں تمہارے پاس ایک بڑھیا مسلمان عورت کو روانہ کرتا ہوں۔ یہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی اور خود ہتھیار باندھ کر ان کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچہ پر حملہ کرتی تھی۔

جن سپاہیوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کیے اور مستعدی سے ہتھیار چلائے اور اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے۔

جس روز یہ گرفتار ہوئی، اس دن یہ گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی۔ اس کے پاس بندوق تھی جس سے اس نے بہت سے نشانے مارے اور سپاہی کہتے ہیں کہ تلوار اور بندوق کے وار سے خود اس نے ہمارے بہت سے آدمی قتل کر ڈالے۔ مگر جیسا کہ امید تھی اس کے ساتھی بھاگ گئے اور یہ زخمی ہو کر گرفتار ہوئی۔

جنرل صاحب کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے عورت سمجھ کر اس کے رہا کر دینے کا حکم دیا' مگر میں نے ان کو روکا اور کہا کہ اگر یہ رہا ہو گئی تو شہر میں جا کر اپنی باطنی اور غیبی طاقت کا دعویٰ کرے گی اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اس کی رہائی کسی مخفی اثر کا نتیجہ معلوم ہو گی اور ممکن ہے کہ اس سے یہ عورت فرانس کی اس مشہور عورت کی طرح ہمارے واسطے باعث تکلیف ہو جائے جس کا ذکر انقلاب فرانس کی تاریخ میں مذکور ہے۔[1]

جنرل صاحب نے میرے مشورہ کو قبول کیا اور اس عورت کو قید کرنے کی تجویز قرار پائی۔ لہٰذا آپ کی خدمت میں اس کو روانہ کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کی حراست کا معقول بندوبست کریں گے کیونکہ یہ ڈائن بہت ہی اندیشناک عورت ہے۔ ہڈسن۔"

سبز پوش عورت کی حقیقت

دہلی کی عام روایتوں اور اس سرکاری افسر کے خط کی تصدیق کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ اس سبز پوش عورت کی حقیقت معلوم ہو جائے مگر قابل اطمینان بیان ایک بھی میسر نہ آیا۔ جو لوگ اس عورت سے واقف ہیں' وہ اسی قدر بیان کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس کو جوش دلانے اور عوام کو جمع کر کے لڑانے کو لے جاتے دیکھا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آتی تھی۔

البتہ ایک قصہ ایسا سنا ہے جو اس واقعہ سے تھوڑا بہت متعلق معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وہی عورت ہو جس کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

ریاست ٹونک کے ایک صاحب نے بیان کیا کہ ان کے والد' حضرت حاجی لال محمد صاحب چشتی نظامی کے مرید تھے۔ حاجی صاحب حضرت مولانا فخر الدین چشتی نظامی دہلوی کے خلیفہ تھے اور ان کا مزار درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مشرقی دروازے میں داخل ہوتے ہی سنگ مرمر کے ایک کٹہرہ میں نظر آتا ہے۔

ٹونک کے راوی کا بیان ہے کہ میرے والد حاجی صاحب کے ہاتھ پر بمقام اجمیر شریف مرید ہوئے تھے اور جس وقت انہوں نے بیعت کی تو ایک مجذوب نما عورت حاجی صاحب کی خدمت میں بیٹھی تھی اور کہہ رہی تھی' میرے لیے شہید ہونے کی دعا مانگو۔ اس کی درخواست کے الفاظ تو بالکل ہوش و حواس میں ادا ہوتے تھے' مگر اس کی حرکتیں دیوانوں کی سی تھیں۔

حاجی صاحب نے دیر تک کچھ جواب نہ دیا اور آخر جوش میں آ کر فرمایا:

"نفس پر جہاد کر کہ اس سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہے۔"

۱۔ انقلاب فرانس کے ایام میں ایک عورت اسی طرح دشمنوں سے لڑتی تھی اور ہزاروں آدمی اس کو غیبی اور آسمانی قوت کا ظہور سمجھ کر اس کے ساتھ ہو گئے تھے جس سے بڑا سخت کشت و خون ہوا تھا اور عوام اس کو نا قابل ہلاکت تصور کرنے لگے تھے۔ آخر فرانس کی حریف فوج نے اس کو زندہ جلا دیا تھا' تب یہ فتنہ دبا تھا۔ اس عورت کا نام جون آف آرک تھا۔ اسی عورت کی طرف خط میں اشارہ کیا گیا ہے۔ (حسن نظامی)

عورت نے کہا "تو کیا نفس مجھ کو قتل کرے گا۔ جب شہادت پاؤں گی میں تو نفس کو قتل کروں گی اور نفس کے غلاموں کی شہادت لوں گی۔"

اس پر حاجی صاحب نے تبسم فرمایا اور کچھ دیر تک سکوت کر کے ارشاد کیا:

"مہندی کے پتے سبز ہیں مگر باطن سرخ رکھتے ہیں۔ جا سبز ہو اور سرخ بن۔"

یہ استعارہ ہم سب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا' مگر وہ عورت قدموں پر گر پڑی اور ان کو بوسہ دے کر کہیں چلی گئی۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے حضرت حاجی صاحب کا مطلب سمجھ لیا اور جو چاہتی تھی وہ اس کو مل گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے اس عورت کو درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحبؒ میں دیکھا کہ سبز لباس پہنے ہوئے حضرت مولانا فخر صاحبؒ کے مزار پر مراقب بیٹھی ہے۔ جب وہ فارغ ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ "تم وہی عورت ہو جس کو میں نے اجمیر شریف میں دیکھا تھا" تو اس نے کہا "ہاں بھائی! میں وہی ہوں۔ اور تمہاری پیر بہن ہوں۔"

میں نے کہا "آہاہا۔ تم بھی حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو۔" بولی "ہاں میں انہی کی لونڈی ہوں۔" میں نے پوچھا "تمہارا مکان کہاں ہے اور یہ درویشی کب سے لی" تو اس نے اپنا قصہ اس طرح بیان کیا۔

میرے دادا احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں سردار تھے۔ جب مرہٹوں سے پانی پت پر لڑائی ہوئی ہے تو وہ اس میں موجود تھے اور اسی میں شہید ہوئے۔ میرے والد بھی احمد شاہ کی فوج میں تھے' مگر ان کی عمر اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ اپنی بیوہ والدہ کے ہمراہ کچھ دن لاہور میں رہے اور اس کے بعد ریاست بہاول پور چلے گئے' جہاں معمولی نوکری سے گزر اوقات کی اور وہیں ان کی شادی ہوئی۔ میرے دو بھائی ہوئے تھے مگر زندہ نہ رہے۔ ان کے بعد میں پیدا ہوئی اور ابتدائی عمر بہاول پور میں گذری۔ اس کے بعد والدین کے ہمراہ ریاست جے پور میں آ گئی' جہاں میرے والد نے نوکری کر لی تھی۔ یہیں ان کا انتقال ہو گیا اور میں نے راجہ صاحب کے ایک مسلمان چوبدار سے شادی کر لی۔

ہندالولی کا حکم

میرا شوہر بیمار تھا اور زندگی کی کچھ امید نہ رہی تھی۔ میں اس کے سرہانے بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھی کہ بے اختیار میری زبان پر ہندالولی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا نام آیا کہ الٰہی ان کے صدقہ سے میرے خاوند کو تندرست کر دے۔ دعا کرتے کرتے میں سو گئی تو خواب میں دیکھا' چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور خلقت بجھانے کو اس پر پانی ڈالتی ہے تو وہ پانی بھی آگ کا شعلہ بن کر برتنوں سے نکلتا ہے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر گھبرا گئی' تو سامنے ایک بزرگ کو کھڑا دیکھا جو فرماتے ہیں "اری او عورت! اپنا سر قربان کر۔ جب یہ آگ فرو ہو گی۔" میں نے عرض کیا "کیونکر سر کو قربان کروں۔" ان بزرگ نے فرمایا "کیا تو شہید ہونا نہیں جانتی۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک سبز چادرہ مجھ کو دیا کہ اس کو اوڑھ لے۔ میں نے جونہی اس کو اوڑھا' ہوا میں اڑ گئی۔ جوں جوں اوپر اڑتی تھی چاروں طرف سے آوازیں آتی تھیں کہ یہ شہید ہے یہ شہید ہے۔ یہ سنتے ہی آنکھ کھل گئی۔

دیکھا تو شوہر سکرات میں تھا اور اسی میں اس کی رحلت ہو گئی۔ خاوند کے مرنے سے مجھ کو بہت صدمہ ہوا اور میں

کچھ دیوانی سی ہو گئی اور اجمیر شریف جا کر رہنے لگی۔ وہیں حضرت حاجی صاحب کی زیارت نصیب ہوئی اور میں نے ان سے بیعت کی۔ اب میں اکیلی تھی' کیونکہ والدین پہلے مر چکے تھے۔

اس دن سے میرے دل میں بھی یہی سمائی ہے کہ ہندالولی خواجہ اجمیریؒ نے مجھ کو شہید ہونے کا حکم دیا ہے اور خواب میں انہی کی زیارت مجھ کو میسر آئی تھی۔

اب میں دہلی کی زیارتیں کرنے آئی ہوں اور زیادہ حصہ دادا پیر (یعنی حضرت مولانا فخر صاحبؒ) کے مزار پر رہتی ہوں۔

پرسوں دادا پیر صاحب خود خواب میں آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا تو سبز پوش شہید ہے۔

ٹونک والے صاحب کا بیان ہے کہ اس عورت کی یہ عجیب باتیں سن کر میں واپس چلا آیا اور اس کے کچھ دن بعد دہلی میں غدر ہو گیا۔

اس حکایت سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ سبز پوش عورت جس کا ذکر غدر دہلی کے قصہ میں آیا ہے' یہی ہو اور اسی نے اپنے دماغی جنون کے سبب یہ حرکت کی ہو۔

قدرت کے اسرار

اگر واقعی غدر میں انگریزی فوج سے لڑنے والی اور عوام کو لڑائی پر آمادہ کرنے والی یہی عورت تھی' تو تاریخ میں یہ ایک عجیب واقعہ سمجھا جائے گا۔

مگر میرا خیال ہے کہ ٹونک والے صاحب نے جس عورت کا قصہ بیان کیا' وہ اس عورت سے جو غدر دہلی میں نمودار ہوئی' زیادہ مناسبت نہیں رکھتا۔

کیونکہ حاجی لال صاحب کی مریدہ وہ عورت گو سپاہی کی پوتی اور بیٹی تھی' مگر ایسے واقعات موجود نہیں ہیں جن سے یہ ثابت ہو کہ اس نے بندوق اور تلوار چلانا کہاں سیکھا۔ نہ ایسی وجوہات معلوم ہوئیں جو سبز پوش عورت کو گھوڑے پر سوار ہونے اور لڑائی کی قواعد جاننے کی شہادت دے سکیں۔ ایک ایسی عورت جس کی بیان شدہ زندگی میں کہیں بھی فوجی مصروفیت کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ یکایک ایک ایسی قواعد دان اور گھوڑے سوار ہتھیار چلانے والی کیونکر بن گئی۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ غدر کی لڑاکا عورت کوئی اور ہو گی جس کو حاجی لال صاحب کی مریدہ سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

البتہ ایک خفیف شبہ اس کا ہوتا ہے کہ حاجی لال صاحب کی مریدہ بوجہ موروثی سپاہی ہونے اور شہادت کے خیال میں محو رہنے کے سبب ممکن ہے غدر کے ہنگامہ سے متاثر ہوئی ہو اور باغی افواج میں شریک ہو کر اس نے گھوڑے کی سواری اور ہتھیار چلانا سیکھ لیا ہو اور فوجوں کے فرار کے بعد جوش شہادت میں از خود رفتہ ہو کر دہلی کے عام شہریوں کو لڑائی پر آمادہ کیا ہو۔

یا ممکن ہے کہ غدر کے بانی لوگوں نے ایک نیم عقل اور شہادت کی شوقین عورت کو شکار کھیلنے کی ٹٹی بنا لیا ہو اور انہی کی سعی سے اس نے لڑائی کے ہنر سیکھے ہوں۔

بہر حال یہ عورت کوئی بھی ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا واقعہ قدرت کے اسرار میں شمار ہونے کے قابل ہے اور غدر کی تاریخ لکھنے والوں نے اگر اس عجیب قصہ کو نہیں لکھا تو ایک دلچسپ حصہ چھوڑ دینے کا جرم ان سے سرزد ہوا۔

ایشیا اور ہندوستان میں مذہبی عقائد اور بعض اوقات محض خیالی توہمات ایسے ایسے شاندار کام کر جاتے ہیں، جن کے سامنے عقل وتدبیر حیران رہ جاتی ہے۔

اگر غدر کی سبز پوش عورت سے بلوہ فساد کے علاوہ کسی جائز فوجی کام میں مدد لی جاتی یا اس کو تاریخ میں کوئی اور کام کرنے کا موقع ملتا تو اس کا نام بھی چاند بی بی اور رضیہ بیگم اور نور جہاں کی طرح مشہور ہو جاتا۔

مجھ کو مسٹر ہڈسن کی اس تحریر سے اتفاق ہے کہ اگر جنرل صاحب اس سبز پوش عورت کو رہا کر دیتے اور مسٹر ہڈسن کا کہنا نہ مانتے تو یقیناً وہ عورت انگریزی فوج کو کسی دوسری صورت سے عرصہ دراز تک پریشان کرتی اور کچھ مشکل نہ تھا اگر وہ ہندوستان میں بجھے ہوئے جوش انقلاب کو پھر ایک نئی صورت سے زندہ کر دیتی۔ پھر اس دوسرے تلاطم کا مقابلہ انگریزوں کو آسان نہ ہوتا اور معلوم نہیں حالات کیا سے کیا ہو جاتے۔

میرے شبہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صوفیائے کرام کے متوسل لوگ خلاف شریعت فتنہ وفساد میں حصہ لینا جائز نہیں سمجھتے۔ اگر یہ سبز پوش عورت واقعی حاجی لال صاحب کی مرید تھی تو اس نے غدر جیسے خلاف شریعت محاربہ میں کیونکر شرکت کر لی۔ ممکن ہے اس کو اسی طرح بہکا لیا گیا ہو جیسے کہ اور بہت سے پابند شریعت مسلمان بہک گئے تھے اور انہوں نے غدر کو جہاد سمجھ لیا تھا۔

میں چاہتا ہوں کہ اور کسی ہندوستانی کی نظر سے کسی انگریزی یا دیسی تاریخ میں اس سبز پوش عورت کا قصہ گذرا ہو اور میرے بیان سے زائد حالات معلوم ہوئے ہوں تو وہ مجھ کو مطلع فرمائیں۔ تاکہ میں تاریخ غدر دہلی میں ان کو درج کر دوں۔

سبز پوش عورت کے باغیانہ فعل سے کسی ہندوستانی کو ہمدردی نہ ہوگی۔ تاہم ہر ہندوستانی اس کی دلیری اور جرأت اور مردانہ فوجی کمان کے واقعہ کو فخر سے یاد رکھنا پسند کرے گا اور چاہے گا کہ اس عورت کے اور حالات بھی معلوم ہوں تاکہ ہندوستان کا فخر ایک جائز حد کے اندر ہمیشہ برقرار رہے۔

آخر میں مجھ کو محاصرۂ دہلی کے کمانڈر کی تعریف کرنی ضروری ہے جس نے برٹش شرافت کا اظہار کیا اور اس بہادر عورت کو قتل کی سزا سے بچا لیا۔ حالانکہ اس نے بہت زیادہ نقصان جان انگریزی افواج کا کیا تھا۔ کیا انبالہ کے کوئی صاحب اس واقعہ پر روشنی ڈالیں گے۔

☆ ☆ ☆

غمگین شہزادی

شہزادی کا موجودہ گھر

اس گھر کی کچی دیواریں تھیں، جن کا ایک حصہ اسی برسات میں گر گیا ہے اور خراب ہو گیا ہے۔ دروازہ پر ٹاٹ کا

ایک پھٹا ہوا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے آواز دی تو نوکرانی بڑھیا باہر آئی اور شہزادی صاحبہ نے مجھے اندر بلالیا۔

اس مکان کا صحن بہت چھوٹا ہے۔ دو چار پائیاں مشکل سے آتی ہوں گی۔ دالان بھی اتنا مختصر ہے کہ دو چار پائیوں کی بھی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ دالان کے شمال میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بھی ہے۔

جب میں اندر گیا شہزادی صاحبہ بوریے پر بیٹھی تھیں۔ دالان میں ایک طرف چار پائی پڑی ہوئی تھی اور اس کے سامنے ایک بوریہ بچھا ہوا تھا، جس پر بیٹھی ہوئی شہزادی صاحبہ پن کٹی میں اپنا پان کوٹ رہی تھیں۔ بوریہ بہت پرانا تھا اور جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ پیوند لگی ہوئی ایک سفید چادر بھی چار پائی پر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ چھوٹا تھا اور ذرا میلا تھا۔ شہزادی صاحبہ کے سامنے مٹی کی ایک بدھنی رکھی تھی، جس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ شہزادی صاحبہ اس سے اگال دان کا کام لیتی ہیں۔ ان کی دائیں طرف پٹاری رکھی تھی جو اگرچہ بدقلعی تھی، لیکن اس پر پان کے دھبے نہیں تھے۔ دالان کی کڑیاں بہت بوسیدہ تھیں۔ گلہریوں اور چوہوں نے تختوں کو خراب کر رکھا تھا۔

شہزادی صاحبہ کا حلیہ

شہزادی صاحبہ کا سر بالکل سفید ہے۔ پلکیں اور بھویں بھی سفید ہوگئی ہیں۔ جوانی میں ان کا قد لمبا ہوگا، اس واسطے اب بہت جھک گئی ہیں۔ ان کا لباس ستھرا تھا، لیکن ہر کپڑے میں کئی کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ ان کی آواز بہت صاف اور مضبوط ہے اور ان کی بول چال نہایت میٹھی اور مؤثر اور خالص اردو میں ہوتی ہے۔ وہ نہایت تمکنت اور وقار کے ساتھ بات کرتی ہیں۔ ان کے چہرے پر جھریاں بہت زیادہ ہیں اور جسم بھی بہت کمزور ہے۔

بات چیت

جب میں ان کے سامنے گیا تو ''آداب عرض ہے'' کہا۔ بولیں ''جیتے رہو۔ میاں جب سے آنکھیں خراب ہوئی ہیں، درگاہ شریف میں حاضر نہیں ہو سکتی۔ تم کو کبھی دیکھا نہیں، لیکن مدت سے نام سنتی ہوں۔ اب بڑی بی نے نام لیا کہ خواجہ صاحب آئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں تو میں بہت خوش ہوئی کہ جن کا نام سنتی تھی وہ خود میرے گھر میں آگئے۔ ان سے ہمارے بزرگوں کو بڑی عقیدت تھی اور میں بھی ہمیشہ سترہویں کے عرس میں جایا کرتی تھی۔ اب آنکھیں جاتی رہیں۔ ہاتھ پاؤں سے معذور ہوگئی۔''

''بتایئے کیونکر آنا ہوا۔'' میں نے کہا ''آنے کی غرض ابھی ظاہر کروں گا، مگر پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو اس مکان میں کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی۔ یہ تو بہت ہی چھوٹا مکان ہے اور چھت میں جگہ جگہ سوراخ ہیں۔ مٹی جھڑتی ہوگی۔'' بولیں ''ارے میاں! اب بھلا فکر کیا۔ جب تقدیر نے قلعے اور محل چھڑوا دیئے تو اب جو کچھ بھی میسر آجائے غنیمت ہے۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کرایہ کا مکان اس سے اچھا اور کیا ہوگا۔ چھت سے مٹی جھڑتی ہے اور کوئی رات ایسی نہیں آتی کہ دو چار دفعہ پلنگ کی چادر صاف نہ کرنی پڑے۔ ایک وقت تھا کہ لال قلعہ کے اندر اپنے محل میں سوتی تھی۔ چھت میں کسی چڑیا نے گھونسلا بنا لیا تھا۔ اس کے کچھ تنکے میرے بچھونے پر گر پڑے تو رات بھر نیند نہ آئی یا ایک یہ وقت ہے کہ رات بھر مٹی جھڑتی ہے اور اس

تکلیف کو سہنا پڑتا ہے۔"

میں نے پوچھا "سرکار سے کچھ پنشن ملتی ہے۔" بولیں "جی ہاں دس روپے مہینہ مدت سے مل رہا ہے۔" میں نے کہا "کچھ اور آمدنی بھی ہے۔" بولیں "جی ہاں ایک مکان ہے جس کا کرایہ سات روپے مہینہ آتا ہے۔ میں پہلے اسی میں رہتی تھی، مگر جب سے آنکھیں گئیں تو دس روپے میں گذارہ نہ ہو سکا، اس واسطے مکان کرائے پر دے دیا اور میں خود کم کرایہ کے مکان میں آ گئی۔ اب ہم دو آدمی ہیں۔ ایک یہ بڑی بی ہیں۔ ایک میں ہوں۔ مکان کا کرایہ اور کھانے کپڑے میں ہم دونوں کا گذارہ سترہ روپے میں پان چھالیہ کا بھی خرچ ہے۔ نذر نیاز کا بھی خرچ ہے۔"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے حالات مجھے بتائیں، تاکہ میں ان کو کتاب میں لکھوں کیونکہ میں نے آپ کے خاندان کے بہت سے مردوں اور عورتوں کے حالات شائع کیے ہیں۔"

یہ بات سنتے ہی شہزادی صاحبہ نے پان کا کونا چھوڑ کر میری طرف رخ کیا اور کہا "نا میاں مجھ کو یہ منظور نہیں کہ میرا نام گھر گھر، گلی گلی، کوچہ کوچہ اچھلتا پھرے۔"

میں نے کہا "آپ کا نام شائع نہیں کروں گا۔ صرف حالات شائع کروں گا۔" جواب دیا "وہ حالات ہی کیا ہیں۔ فقط دو باتیں ہیں" ہم بادشاہ تھے اور اب ہم فقیر ہو گئے۔" اس سے زیادہ پوچھو تو یہ جواب ہے کہ "اب ہم مر بھی جائیں گے۔"

سرگذشت

میں نے کہا "تو اپنے حالات بتا دیجئے۔ میں نام اور پتہ شائع نہیں کروں گا۔" شہزادی صاحبہ کو اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ وہ بہت دیر چپکی بیٹھی رہیں اور پٹاری اپنے قریب سرکا کر میرے لیے ایک پان کا ٹکڑا بنایا اور ٹھنڈا سانس لے کر بولیں۔ "میاں غدر میں میری عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ ہم قلعہ کے اندر رہتے تھے۔ بادشاہ سلامت ہمارے خاندان سے کچھ ناراض تھے، لیکن ہماری تنخواہ مہینہ کے مہینہ مل جاتی تھی۔ میرے تین بھائی تھے اور بہن فقط ایک میں تھی۔ والد نے آخر عمر میں ایک شادی کر لی تھی حالانکہ میری اماں بھی زندہ تھیں اور اس بڑھاپے کی شادی کی وجہ سے میری اماں اور سوکن میں بھی لڑائی جھگڑا رہتا تھا اور ہم تینوں بہن بھائی بھی سوتیلی ماں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، مگر مجھ سے پہلی ماں کو بہت محبت تھی اور میں اپنی سگی اماں اور سوتیلی اماں کی لاڈلی بیٹی کہلاتی تھی۔

"ہمارے گھر میں کئی عورتیں اور کئی مرد خدمتگاری پر نوکر تھے۔ غدر سے چھ مہینے پہلے میری سوتیلی اماں کو ہیضہ ہوا۔ وہ مر گئیں اور میرے دو بھائی بھی اسی زمانے میں ہیضے سے مر گئے اور جب غدر ہوا تو ہم صرف دو بہن بھائی اور ایک ابا حضرت اور ایک اماں حضرت موجود تھے۔

"بادشاہ سلامت قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے اور بھی سب قلعہ کے رہنے والے باہر نکل گئے اور قلعہ خالی ہو گیا مگر ہمارا مکان قلعہ کی عمارتوں سے ذرا الگ تھا اور بہت مضبوط تھا اس لیے ابا حضرت راضی نہیں ہوئے اور انہوں نے کہا باہر جائیں گے تو وہاں بھی مریں گے اور باہر کا مرنا بڑی بے غیرتی کا مرنا ہوگا۔ اس واسطے یہیں گھر میں رہو۔

جو خدا کو منظور ہوگا اسی گھر میں ہو جائے گا۔

''بادشاہ سلامت کے جانے کے بعد دو دن تک ہمارے گھر میں کوئی نہیں آیا۔ باہر کے نوکر اور گھر کی ماما ئیں سب بھاگ گئے تھے۔ ہم نے گھر کے دروازے بند کر لیے تھے۔ ڈیوڑھی میں تین چار دروازے تھے اور موٹی موٹی کنڈیاں بھاری بھاری کواڑان میں لگے ہوئے تھے۔ تیسرے دن مکان کے باہر گھوڑوں کی ٹاپوں اور بہت سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آئیں اور کسی نے دروازے توڑنے شروع کیے۔ میرے بھائی کی عمر سولہ برس کی تھی۔ ابا حضرت اور اماں حضرت نے فوراً وضو کیا اور بھائی سے کہا میاں انحوتم بھی وضو کر و مرنے کا وقت آ گیا۔ یہ بات سن کر میرا دل دہل گیا اور میں اماں حضرت کو جا کر لپٹ گئی۔ وہ رونے لگیں اور مجھ کو پیار کیا اور کہا گھبراؤ نہیں اللہ مددگار ہے۔ شاید وہ کوئی صورت جان بچانے کی نکال دے۔ اس کے بعد ان سب نے وضو کیا اور فوراً ہم سب نے مصلے بچھا کر اور سجدے میں سر جھکا کر اللہ میاں سے دعائیں مانگنی شروع کیں۔

دروازے توڑنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ ہم سب سجدے ہی میں تھے کہ دس بارہ گورے اور دس بارہ سکھ بندوقیں لیے ہوئے جن پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں' گھر کے اندر آ گئے۔ ابا حضرت اور بھائی سجدے سے فوراً اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اماں حضرت نے مجھ کو گود میں لے کر چادر سے منہ چھپا لیا۔ ایک سکھ نے ابا حضرت سے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ ابا حضرت نے جواب دیا'' یہ میرا گھر ہے اور میں اسی میں رہتا ہوں۔ شاہ عالم بادشاہ کی اولاد میں ہوں۔'' اس سکھ نے انگریز افسر کو یہ بات سمجھائی۔ انگریز افسر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کچھ کہا جس کو میں نہیں سمجھی تو پھر اس سکھ نے ابا حضرت کو سمجھایا کہ صاحب کہتے ہیں بادشاہ بھاگ گئے اور سب لوگ بھاگ گئے۔ تم کیوں نہیں بھاگے؟ ابا حضرت نے کہا ''بادشاہ ہم سے کچھ ناراض تھے اس واسطے نہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے نہ ہم ان کے ساتھ گئے اور ہم نے سپاہیوں کے بلوے میں بھی کچھ حصہ نہیں لیا اور ہمیں یقین تھا کہ انگریز سرکار بے گناہ آدمیوں کو نہیں ستاتی۔ ہم بے گناہ تھے' اس واسطے ہم نہیں بھاگے۔'' انگریز افسر نے کہا'' تم کو پہاڑی پر چلنا ہوگا۔ ہم تحقیقات کریں گے۔ اگر تم بے گناہ معلوم ہوئے تو تم کو جان کی امان ملے گی۔''

ابا حضرت نے کہا'' میرے ساتھ میری بیوی ہے اور ایک چھوٹی بچی ہے اور یہاں کوئی سواری نہیں ہے اور ان عورتوں کو پیدل چلنے کی عادت نہیں ہے۔'' انگریز افسر نے جواب دیا'' اس لڑائی کے وقت ہم تمہارے لئے سواری کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اگر تم یہاں ٹھہرے رہو گے تو ڈر ہے کہ دوسرے سپاہی یہاں آئیں گے اور بے خبری میں تم کو مار ڈالیں گے۔ اس واسطے تم کو جلدی یہاں سے روانہ ہونا چاہئے۔ ہم دو سپاہی تمہارے ساتھ کریں گے۔ اگر راستے میں کوئی سواری مل جائے گی تو تمہاری عورت اور تمہاری لڑکی اس میں بیٹھ جائیں گی۔ نہیں تو ان سب کو پیدل چلنا ہوگا۔''

مجبوراً ابا حضرت تیار ہوئے اور انہوں نے کچھ قیمتی زیورات اور جواہرات اپنے ساتھ لے کر باقی سارا سامان گھر میں چھوڑ دیا اور فوج والوں کے ساتھ گھر سے باہر نکلے۔ اماں حضرت ہمیشہ بیمار رہتی تھیں اور بہت کمزور تھیں۔ مجھ کو بھائی نے گود میں اٹھا لیا اور ابا حضرت نے اماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم نے اپنے بھرے پُرے گھر کو حسرت کے ساتھ ایک نظر اٹھا کر دیکھا کہ پھر ہم کبھی یہاں نہیں آئیں گے اور ایسا ہی ہوا کہ ہم پھر کبھی وہاں نہیں گئے۔

جب ہم گھر سے نکلے تو وہ انگریز اور سکھ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور دو سکھ سواروں کو ہمارے ساتھ پہاڑی کی طرف بھیج دیا اور وہ خود کسی اور طرف گھوڑے دوڑا کر چلے گئے۔

قلعہ کے دروازے تک تو وہ سکھ سوار آہستہ آہستہ چلتے رہے اور انہوں نے ابا حضرت اور اماں حضرت سے کچھ نہ کہا' کیونکہ اماں حضرت سے چلا نہ جاتا تھا اور وہ ہر دس قدم کے بعد بیٹھ جاتی تھیں اور رعشہ سے ان کا بدن کانپ رہا تھا۔ جب اماں حضرت بیٹھ جاتیں تو وہ سکھ سوار بھی ٹھہر جاتے' لیکن جب ہم قلعہ کے دروازہ کے باہر پہنچ گئے تو ان سواروں نے سخت کلامی شروع کی اور کہا اس طرح تو شام ہو جائے گی تم جلدی جلدی کیوں نہیں چلتے۔ والد نے نرمی سے جواب دیا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ ایک بیمار اور کمزور عورت ہے' جو ساری عمر کبھی پیدل نہیں چلی۔ ہم شرارت اور سرکشی سے ایسا نہیں کرتے۔ عورت اور بچے کی وجہ سے مجبور ہیں۔ سوار یہ سن کر خاموش ہو گئے' مگر میرے بھائی کے منہ سے بے اختیار یہ بات نکل گئی کہ تم ہمارے ملک کے ہو۔ تم کو رحم نہیں آتا۔ اس پر ایک سکھ نے کہا کہ ہم کیا کریں۔ حاکم کا حکم ہے۔ بھائی نے کہا حاکم نے یہ نہیں کہا کہ ہم پر ایسی سختی کرنا۔ سکھ سوار نے جواب دیا ہم نے کونسی سختی کی' لیکن اب سختی کرنی پڑے گی۔ تم لوگ جان کر چلنے میں دیر لگاتے ہو۔ یہ کہہ کر ایک سوار ہمارے پیچھے آ گیا اور ایک آگے ہو گیا۔ اماں حضرت گھوڑے کو اپنے پیچھے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ان کو اختلاج کا مرض تھا اور یکا یک اختلاج کا دورہ شروع ہو گیا اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑیں اور ان کے منہ سے بے اختیار ہائے ہائے نکلنی شروع ہوئی۔ سکھ سوار یہ حالت چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا اور کچھ دیر کے بعد اس نے ابا حضرت سے کہا میں پیدل چلتا ہوں تم اس بیمار عورت کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ آخر ابا حضرت نے اماں حضرت کو گود میں اٹھا لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلے اور وہ بے چارہ سکھ سوار پہاڑی تک پیدل گیا اور میں بھائی کی گود میں پہاڑی پر پہنچی۔

پہاڑی پر انگریزوں کی فوج چاروں طرف ٹھہری ہوئی تھی۔ ہم کو بھی ایک طرف خیمہ میں ٹھہرا دیا گیا اور ان سکھ سواروں نے فوجی لانگری سے روٹی لا کر دی اور وہ رات ہم نے اسی خیمہ میں گذاری۔

دوسرے دن صبح فوج کے جرنیل نے ہم سب کو اپنے سامنے بلایا۔ دلی کا کوئی مخبر اس انگریز کے پاس کھڑا تھا۔ اس سے پوچھا کہ تم ان کو جانتے ہو۔ اس مخبر نے کہا ہاں میں جانتا ہوں یہ بادشاہ کے خاندان سے ہیں اور جب لال قلعہ کے اندر انگریز مردوں اور عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تو اس شخص نے ان کے قتل کرانے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ سن کر جرنیل نے ابا حضرت کی طرف بہت غصہ کی نظر سے دیکھا۔ ابا حضرت نے جواب دیا کہ یہ شخص جھوٹ کہتا ہے۔ یہ پہلے میرے ہاں نوکر تھا اور چوری کے الزام میں میں نے اس کو ایک دفعہ بہت پٹوایا تھا اور نوکری سے موقوف کر دیا تھا۔ اس واسطے دشمنی سے یہ ایسا کہتا ہے۔ آپ اس سے اتنا پوچھیے کہ بہادر شاہ بادشاہ کتنے سال سے مجھ سے ناراض تھے اور میرا سلام کتنے عرصے سے بند تھا۔ مخبر نے جواب دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ان کے ہاں نوکر تھا' مگر یہ غلط ہے کہ مجھے چوری کے الزام میں انہوں نے پٹوایا تھا۔ میں نے خود ان کی نوکری چھوڑ دی تھی' کیونکہ یہ تنخواہ کم دیتے تھے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ بادشاہ ان سے ناراض تھے' لیکن جب غدر ہوا تو انہوں نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے ان کے پاس آنا جانا شروع کیا اور جس دن انگریز قتل کیے گئے تو یہ اور ان کا لڑکا دونوں بہت کوشش کر رہے تھے اور ان لوگوں سے حجت بازی کرتے تھے جو

انگریز بچوں اور عورتوں کے خلاف رائے دے رہے تھے کہ یہ بات اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس وقت ان دونوں نے یہ کہا کہ سانپ کو مارنا اور اس کے بچوں کو چھوڑ دینا عقل مندوں کا کام نہیں ہے اور محض انہی دونوں کے کہنے سے ان بچوں اور عورتوں کو قتل کیا گیا۔

یہ سن کر جرنیل غصے سے آگ بگولا ہوگیا اور اس نے پھر ابا حضرت کی کوئی بات نہ سنی' حالانکہ وہ برابر کہتے رہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے' مگر جرنیل کی آنکھیں لال ہوگئی تھیں۔ اس نے کوئی بات نہ سنی اور حکم دیا کہ ابھی ان دونوں کو گولی سے اڑا دو اور پھر یہ کہا کہ اگرچہ ان دونوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل کرایا' مگر ہم ان پر رحم کرتے ہیں اور اس کی عورت اور بچے کو چھوڑ دیتے ہیں اور ان دونوں کو چھاؤنی سے نکال دو۔ یہ جہاں چاہیں چلی جائیں۔

قتل کا وقت

سپاہی گورے اور دیسی آگے بڑھے اور انہوں نے بھائی اور ابا حضرت کے ہاتھ پکڑ کر کمر کے پیچھے باندھے۔ ابا حضرت مجھ کو دیکھ کر رونے لگے' مگر بھائی چپکے کھڑے رہے۔ اماں حضرت نے ایک چیخ ماری اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ میں دوڑی کہ ابا حضرت کو چمٹ جاؤں' مگر ایک سپاہی نے مجھ کو زور سے دھکا دیا اور میں اماں حضرت کے اوپر گر پڑی اور میں نے دیکھا کہ ابا حضرت اور بھائی کو سپاہی کھینچتے ہوئے دور لے گئے اور ان کے سامنے پانچ چھ سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے ہوئے اور ان کے پاس جرنیل بھی کھڑا ہو گیا اور اس نے کچھ زور زور سے باتیں کیں جن کو میں سمجھ نہیں سکی۔ اس کے بعد سپاہیوں کو اشارہ کیا اور سپاہیوں نے بندوقیں اپنی چھاتی پر رکھیں اور بندوقوں کا منہ ابا حضرت اور بھائی کی طرف کیا۔ اس وقت ابا حضرت کی آواز آئی اور انہوں نے میرا نام پکارا اور کہا "لو بیٹی! اللہ بیلی' ہم دنیا سے جاتے ہیں" اور بھائی کی آواز آئی "اماں! اماں! مجھ سے تمہاری تنہائی دیکھی نہیں جاتی۔ سلام میں مرتا ہوں۔"

بندوقوں کی آواز آئی اور بہت سا دھواں نکلا۔ میں نے دیکھا بھائی اور ابا جان خاک میں لوٹ رہے ہیں۔ میں رو رہی تھی اور میرا دل ڈر کے مارے بیٹھا جاتا تھا۔ اماں کو ذرا ہوش آیا اور میں نے ان سے کہا "بھائی کو اور ابا کو مار ڈالا۔ دیکھو وہ خاک میں تڑپ رہے ہیں۔ اے ہے اماں جان کے سینے سے خون ابل رہا ہے۔ اب میرے بھائی اور ابا مجھ سے بچھڑ گئے۔ اب وہ مجھ سے کبھی نہیں ملیں گے۔ ابا نے تو مجھے پکارا بھی تھا اور بھائی نے تم کو پکارا تھا۔ اچھی اماں اب کیا ہوگا۔ کیا یہ ہم کو بھی مار ڈالیں گے۔ کیا یہ ہم کو قیدی بنالیں گے۔" اماں دونوں ہاتھوں کو ٹیک کر سہارے سے اٹھیں اور انہوں نے بھائی کی اور ابا حضرت کی لاشوں کو غور سے دیکھا۔ ان کا تڑپنا بند ہو گیا تھا اور بیتاب ہو کر کہا "میرا بیٹا! میرا لال! میری سولہ برس کی محنت!!! میری زندگی کا آخری سہارا!!! میرا دولہا مجھ سے چھن گیا۔ میں مٹ گئی۔ میرا اس دنیا میں کچھ نہیں رہا۔ میں دنیا میں آئی تھی۔ یا اللہ یہ خواب ہے یا سچ مچ مجھ پر مصیبت آئی ہے۔ میرا سرتاج ہی خاک میں مل گیا۔ وہ بھی جوان بیٹے کے پاس خون میں نہایا ہوا پڑا ہے۔ اے مخبر! خدا تجھ کو غارت کرے تو نے بالکل جھوٹ بولا۔ یہ دونوں تو غدر کی شروعات سے آخر تک گھر سے بھی نہیں نکلے۔ ارے تو نے کس دن کا بدلہ لیا۔ مجھ بیمار دکھیا پر بھی تجھ کو رحم نہ آیا۔ تو نے اس معصوم بچی کا بھی خیال نہ کیا اور ہمارے وارثوں کو بے خطا اور بے قصور خون میں ڈبو دیا۔"

اماں یہ کہہ رہی تھیں کہ دیسی فوج کے سپاہی آئے اور مجھ کو اور اماں کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور کھینچتے ہوئے لے چلے۔ ہم دونوں لاشوں کے پاس سے گذرے۔ گولیاں سینوں پر اور چہروں پر لگی ہوئی تھیں۔ خون نے سب کچھ چھپا دیا تھا اور لاشیں چپ چاپ پڑی تھیں۔ سپاہی ہم کو کشاں کشاں لیے جا رہے تھے۔ نہ اماں چل سکتی تھیں۔ نہ میں چل سکتی تھی، مگر وہ بکریوں کی طرح ہم کو کھینچے لیے جا رہے تھے۔ پہاڑی کے پتھروں سے ہمارے پاؤں لہولہان ہو گئے تھے اور میں نہیں کہہ سکتی کہ دنیا میں جیسی تکلیف اس وقت ہمیں تھی ایسی تکلیف اور بھی کسی کو پیش آ سکتی ہے۔

فوجی چھاؤنی سے باہر لا کر سپاہیوں نے ہم کو چھوڑ دیا۔ اماں بالکل بے ہوش پڑی تھیں اور میں ان کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک گھسیارہ گھاس کی گٹھڑی لیے ہوئے وہاں سے گذرا اور میرے پاس آیا اور اس نے گٹھڑی سر سے اتار کر اماں کو دیکھا اور کہا یہ عورت تو مر گئی۔

وہ ہندو تھا۔ مجھ کو وہاں چھوڑ کر چھاؤنی میں گیا اور وہاں سے دو تین مسلمان گھسیاروں کو لایا اور ان سب نے کہا یہ عورت مر گئی۔ انہوں نے میرے اور میری اماں کے ہاتھوں سے اور گلے سے زیور اتار لیا اور کہا کہ جب ان کے مرد مارے گئے تو ان کے پاس سے بہت سے جواہرات نکلے اور وہ سب سرکاری خزانہ میں گئے مگر یہ ہمارا حق ہے۔ اس کے بعد انہوں نے گڑھا کھود کر اماں کو دبا دیا اور دو آدمی مجھ کو اٹھا کر اجمیری دروازے کی طرف لائے اور یہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھی کہ خانم کے بازار کے مسلمان سنار اپنی عورتوں کو لیے ہوئے وہاں آئے جو قطب صاحب جا رہے تھے۔ وہ مجھ کو بھی اپنے ساتھ قطب صاحب لے گئے۔

اور جب شہر میں امن چین ہو گیا اور وہ مسلمان سنار بھی دہلی میں واپس آئے تو مجھ کو میرے رشتے کے چند شہزادوں کے حوالے کر دیا اور میں انہیں کے پاس رہ کر بڑی ہوئی اور انہیں میں میری شادی ہوئی اور شادی کے بعد ہی میری پنشن ہو گئی۔ خدا نے مجھے کئی بچے دیئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ شوہر کا بھی انتقال ہو گیا اور اب چار سال سے آنکھیں بھی جاتی رہیں۔

سن لیا میاں۔ مجھ دکھیا غمزدہ کی یہ کہانی ہے۔ میرے رونگٹے رونگٹے سے ہائے کی آوازیں آتی ہیں۔ میں نے اس دنیا میں بس دس برس کی عمر تک عیش دیکھا اور ستر برس مصیبتیں اٹھائیں۔ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن۔ یہ بڑی بی بے چاری مل گئی ہیں۔ بازار سے ضرورت کی چیزیں خرید لاتی ہیں اور رات دن پاس بیٹھی رہتی ہیں اور ہم دونوں آخری عمر کے یہ غمگین دن مل جل کر جس طرح ہوتا ہے گذار رہے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نرگس نظر کی مصیبت

شہزادی نرگس نظر میرزا شاہ رخ ابن بہادر شاہ کی بیٹی تھیں۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان کی عمر ستر وسال کی تھی۔ موجودہ لال قلعہ دہلی میں دیوان خاص اور موتی مسجد کے قرب میں اور گورا بارک کے شرق میں ایک تہمین

تالاب ہے' جس کے وسط میں ایک خوبصورت محل بنا ہوا ہے اور اس کے شمال سے نہر آتی ہے۔ سنگ مرمر کی مچھلیاں اور چراغدان بنے ہوئے ہیں۔ ان پر سے نہر کا پانی گذرتا ہوا اس تالاب میں آتا تھا۔ میرزا شاہ رخ بہادر اسی جل محل میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا' اس لیے میرزا صاحب کو اپنی بیٹی نرگس نظر سے بہت ہی محبت تھی۔

جل محل کو کشمیری شالوں اور رومی قالینوں اور بنارسی کپڑوں سے خوب ہی آراستہ کیا گیا تھا۔ نرگس نظر کی طبیعت میں نفاست و نزاکت و سلیقہ مندی بہت زیادہ تھی۔ ان کا محل سارے قلعہ میں سب حویلیوں اور محلات سے زیادہ خوبصورت اور آراستہ سمجھا جاتا تھا۔

نرگس نظر کا نظام اوقات یہ تھا کہ وہ صبح سورج نکلنے کے بعد بیدار ہوتی تھیں۔ گرمی کے موسم میں ان کا چھپر کھٹ صحن میں بچھایا جاتا تھا' جہاں سنگ مرمر کا فرش تھا۔ چھپر کھٹ کے پائے اور ڈنڈے سونے کے تھے۔ اندر ریشمی تکیے رکھے رہتے تھے۔ چار نازک نازک نرم نرم تکیے سرہانے ہوتے تھے اور سرہانے کے تکیوں کے پاس دو چھوٹے چھوٹے گول گول اور تکیے ہوتے تھے جن کو گال (گل) تکیہ کہا جاتا تھا۔ یہ تکیے رخسار کی ٹیک کے لیے تھے کہ اگر شہزادی کا سر تکیوں سے نیچے آ جائے تو گل تکیے ان کے رخسار کو تکلیف سے بچالیں۔ دو تکیے ذرا بڑے بڑے دونوں پہلوؤں میں ہوتے تھے کہ ان سے شہزادی صاحبہ اپنے گھٹنے کو سہارا دے سکیں۔ رات کو جب نرگس نظر مسہری کے اندر جاتی تھیں تو مولسری اور جوئی اور چمپا کے پھول ان کے گل تکیوں کے پاس رکھے جاتے تھے کہ رات کو ان کی خوشبو شہزادی کو مسرور کرتی رہے۔ جوں ہی نرگس نظر مسہری میں گئیں' چار ناچنے والی چھوکریاں آ جاتی تھیں اور ہلکے سروں میں گاتی تھیں' جب شہزادی کو نیند آتی تھی۔ صبح کو بھی سورج نکلنے سے پہلے یہ ناچنے گانے والی لڑکیاں مسہری کے قریب آ کر گاتی تھیں اور ان کی سریلی آوازوں کو سن کر شہزادی صاحبہ بیدار ہوتی تھیں۔

شہزادی بیدار ہونے کے بعد مسہری کے اندر بیٹھ جاتیں اور دیر تک جمائیاں لیتیں۔ انگڑائیاں لیتیں اور گانے والی لڑکیاں ان سے ہنسی کی باتیں کرتیں۔

ایک کہتی' اے حضور جمائی آتی ہے رومال حاضر کروں منہ کو ڈھک لیجیے۔

دوسری کہتی' سرکار کی انگڑائی دیکھنے کو تالاب کی مچھلیاں بیتاب ہو ہو کر پانی کے چہرے پر چلی آ رہی ہیں۔ نرگس نظر آنکھیں مل کر اور مسکرا کر کہتیں' چل دور موئی' مردار کیسی جھوٹی باتیں بناتی ہے' تو چھوکری کہتی۔ میں جھوٹ کہتی ہوں یا سچ آئینے سے پوچھ لیجیے۔ وہ بھی سامنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے اندر بھی تو بال بکھر رہے ہیں۔ وہ بھی تو مہندی لگی لال لال انگلیاں اونچی کر کے سرکار کی انگڑائی کی تعریف کر رہا ہے۔ وہاں بھی تو ایک مستی کا عالم نظر آ رہا ہے۔

تیسری کہتی' آفتاب کی کرنیں لال لال بادلوں سے ایسی نکلیں جیسے سرکار کی لال لال ہونٹوں سے سفید سفید دانت' اور یہ رخسار تو صبح صادق کا نور ہیں۔ بال بکھر کر جو چہرے پر آئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے چودھویں رات کے چاند پر کالے بادل چھائے ہوئے چلے آتے ہیں' مگر چاندنی سے مات ہو کر ان کا کلیجہ شق ہو گیا ہے اور چاند کے چاروں طرف اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو بکھیر دیا ہے۔

نرگس نظر یہ سن کر مسکراتی ہوئی مسہری کے باہر آتیں۔ طشت چوکی پر جاتیں' پھر باہر آ کر کلی اور بیسن سے منہ

ہاتھ دھوتیں۔ پھر جوڑا بدلا جاتا۔ ناشتہ کیا جاتا۔ اس کے بعد گھر کی آرائش کو خود جا کر دیکھتیں اور نئی نئی ایجادیں چیزوں کے سنوارنے میں ہوتیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر گانا ہوتا۔ شام کو چمن میں گلگشت کا معمول پورا کیا جاتا۔ رات کے کھانے میں بڑی بہار ہوتی۔ باجے بج رہے ہیں' گانے ہو رہے ہیں اور مصاحب لڑکیوں کے ساتھ کھانا کھایا جا رہا ہے۔

قلعہ کی آخری رات

جس رات بہادر شاہ بادشاہ لال قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں گئے اور یقین ہو گیا کہ صبح انگریز دہلی کو مفتوح کر لیں گے تو نرگس نظر چپ چاپ جل محل کے کنارے پر کھڑی چاندنی کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا عکس تالاب میں پڑ رہا تھا اور ان پر اپنی دید کا ایک عجیب عالم محویت طاری تھا۔

یکا یک ان کے باپ میرزا شاہ رخ اندر آئے اور انہوں نے کہا'' نرگس بیٹا! میں ابا حضرت (بہادر شاہ) کے ہمراہ جانا چاہتا ہوں۔ تم ابھی چلو گی یا سواری کا بندوبست کر دوں' صبح آ جانا۔'' نرگس نظر نے کہا'' ابا جان! آپ بھی ابھی نہ جائیے۔ پچھلی رات میرے ساتھ چلیے گا۔ میں دادا حضرت کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھتی۔ انگریزی فوج انہی کی تلاش کرے گی اور جو لوگ ان کے ساتھ ہوں گے وہ سب مجرم سمجھے جائیں گے' اس لیے ہمایوں کے مقبرے میں دادا حضرت کے ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے۔ غازی نگر (غازی آباد) میں چلیے۔ وہاں میری انا کا گھر ہے اور سنا ہے' بہت اچھی اور محفوظ جگہ ہے۔ گمنامی اختیار کر کے چلنا چاہئے۔ جب یہ بلا دور ہو جائے گی پھر یہاں آ جائیں گے۔''

میرزا نے کہا۔'' اچھا جیسی تمہاری رائے ہو۔ غازی نگر جانے کے لیے رتھوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ کون کون جائے گا۔''

نرگس نظر نے جواب دیا'' کوئی نہیں صرف میں اکیلی چلوں گی' کیونکہ نوکروں کا ساتھ رکھنا بھی نامناسب ہے اور نوکر ساتھ جانے کے لیے تیار بھی نہیں معلوم ہوتے۔'' میرزا یہ سن کر باہر چلے گئے اور نرگس نظر پھر ماہتاب اور عالم آب کو دیکھنے لگیں۔

کچھ دیر کے بعد نرگس نظر نے نوکر عورتوں کو آواز دی مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ معلوم ہوا سب بھاگ گئے اور نرگس نظر سارے جل محل میں اکیلی ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نرگس نظر نے حاکمانہ آواز دی اور جواب میں کوئی بھی نہ بولا۔ نرگس نظر گھبرا کر محل کے اندر گئیں۔ شمعیں روشن تھیں' مگر کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ نرگس نظر کو اندر ڈر لگا اور وہ پھر صحن میں آ گئیں۔ قلعہ میں جگہ جگہ سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے گھروں کے رہنے والے نکل نکل کر جا رہے ہیں۔ نرگس نظر نے بہت دیر باپ کی راہ دیکھی مگر وہ نہ آئے اور نرگس نظر گھبرا کر رونے لگیں۔ رات کے دو بجے ایک خواجہ سرا محل میں آیا اور اس نے کہا'' صاحب عالم نے فرمایا ہے کہ انگریزی جاسوس میری تلاش میں قلعہ کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ غازی نگر نہیں جا سکتا۔ سواری کا انتظام کر دیا ہے۔ تم خواجہ سرا کے ساتھ چلی جاؤ اور میں بھیس بدل کر کہیں اور چلا جاتا ہوں۔'' نرگس نظر نے گھبرا کر کہا'' آخر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔'' خواجہ سرا بولا'' مجھے معلوم نہیں۔'' نرگس نظر نے حاکمانہ لہجے میں کہا'' جا یہ معلوم کر کے آ کہ ابا حضرت

کہاں جانے والے ہیں۔ وہ لباس بدل کر میرے ساتھ غازی نگر کیوں نہیں چلتے؟''

خواجہ سرا فوراً واپس گیا اور نرگس نظر صحن میں ٹہلتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد خواجہ سرا واپس آیا اور اس نے کہا''ابا حضرت سائیس کے کپڑے پہن کر قلعہ کے باہر چلے گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ کہاں چلے گئے۔ آپ کی سواری کے لیے رتھ تیار ہے۔'' نرگس نظر کو رونا آ گیا اور ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے نہایت بے کسی اور بے بسی کی حالت میں ہچکیاں لے کر آنسو بہائے۔ انہوں نے جواہرات اور زیورات کا صندوقچہ اور چند ضروری کپڑے ساتھ لیے جن کو خواجہ سرا نے اٹھا لیا اور جل محل سے نکلیں اور سوار ہونے سے پہلے مڑ کر جل محل اور اس کی آرائش کو بہت دیر تک کھڑے ہو کر دیکھا۔ پھر کہا''خبر نہیں تجھ کو پھر دیکھنا نصیب ہوگا یا آج تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔''

رات کے تین بج چکے تھے۔ نرگس نظر رتھ میں بیٹھی غازی نگر (غازی آباد) کی طرف جا رہی تھیں۔ صبح آٹھ بجے غازی آباد پہنچ گئیں۔ راستے میں ان کو بہت لوگ آتے جاتے ملے' مگر کسی نے ان کے رتھ کی مزاحمت نہیں کی۔ غازی آباد میں نرگس نظر کی انا کا گھر مشہور تھا۔ جوں ہی نرگس نظر انا کے گھر کے سامنے رتھ سے اتریں انا دوڑتی ہوئی گھر کے باہر آ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے شہزادی کی بلائیں لیں اور اندر لے جا کر بٹھایا اور اپنی حیثیت سے زیادہ خاطر مدارات کی۔

مصیبت

نرگس نظر دو تین روز انا کے گھر میں آرام سے رہیں۔ یکا یک خبر مشہور ہوئی کہ بادشاہ گرفتار ہو گئے اور کئی شہزادے قتل کر دیے گئے اور فوج غازی آباد کو لوٹنے آ رہی ہے۔ نرگس نظر نے جواہرات کا صندوقچہ انا سے کہہ کر زمین میں دفن کرا دیا اور مصیبت کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں سکھ فوج غازی آباد میں داخل ہوئی اور اس نے باغیوں کی تلاش شروع کی۔ مخبروں نے کہا''بادشاہ کی پوتی اپنی انا کے گھر میں موجود ہے۔'' دو سکھ سردار چار سپاہیوں کے ساتھ انا کے گھر میں آئے اور انہوں نے انا کو اور سب گھر والوں کو پکڑ لیا۔ نرگس نظر کوٹھڑی میں چھپ گئی تھیں۔ ان کو بھی کواڑ توڑ کر باہر نکالا گیا اور بے پردہ سامنے کھڑا کیا گیا۔ سردار نے پوچھا''کیا تم بہادر شاہ کی پوتی ہو۔'' نرگس نظر نے کہا''میں ایک آدمی کی بیٹی ہوں۔ بادشاہ کی اولاد ہوتی تو اس غریب گھر میں کیوں آتی۔ اگر خدا نے بادشاہ کی پوتی بنایا ہوتا تو تم اس طرح بے پردہ مجھ کو سامنے کھڑا نہ کرتے۔ تم ہندوستانی ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ اپنے ملک کی عورتوں پر ظلم کرتے ہو۔'' سردار نے کہا''ہم نے کیا ظلم کیا؟ ہم تو یہ دریافت کرتے ہیں کہ تم کون ہو؟ ہم نے سنا ہے کہ تم بہادر شاہ کی پوتی ہو اور تمہارے باپ نے بہت سے انگریزوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قلعہ کے اندر قتل کیا تھا۔'' نرگس نظر نے کہا''جو کرتا ہے وہی بھرتا ہے۔ اگر میرے باپ نے ایسا کیا ہوگا تو ان سے پوچھو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے کسی کو نہیں مارا۔'' یہ سن کر دوسرا نوجوان سکھ سردار بولا''ہاں تم تو آنکھوں سے قتل کرتی ہو۔ تم کو تلواروں اور ہتھیاروں سے مارنے کی کیا ضرورت ہے۔'' نرگس نظر نے نہایت جرأت کے ساتھ جواب دیا' حالانکہ اس کی زندگی میں غیر مردوں سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا ''خاموش رہو۔ بادشاہوں سے ایسی بے تمیزی کے ساتھ بات نہیں کرتے۔ تمہاری زبان گدی کے پیچھے سے نکال لی جائے گی۔'' نوجوان یہ سن کر بگڑا اور اس نے آگے بڑھ کر نرگس نظر کے بال پکڑ لیے اور ان کو زور سے جھٹکا دیا۔ بوڑھے سکھ

سردار نے نوجوان سردار کو روکا اور کہا "عورت کے ساتھ ایسی زیادتی کرنا مناسب نہیں ہے۔" نوجوان سردار نے یہ بات سن کر بال چھوڑ دیئے۔

کرایہ کی بیل گاڑی منگوائی گئی اور اس میں نرگس نظر کو سوار کیا گیا۔ انا اور اس کے گھر والے بھی سب قید ہو کر پیدل ساتھ چلے۔ نرگس نظر سے پوچھا گیا "تمہارا زیور اور روپیہ پیسہ کہاں ہے۔" انہوں نے کہا "میں خود ہی زیور ہوں اور خود ہی سمجھنے والوں کے لئے جواہر اور دولت ہوں' میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔"

یہ سن کر دونوں سردار خاموش ہو گئے اور بہلی کو دہلی کی طرف لے چلے۔

ہنڈن ندی کے پاس گاؤں کے جاٹوں اور گوجروں نے سکھ فوج والوں پر بندوقیں چلائیں اور دیر تک ان کی آپس میں لڑائی ہوتی رہی۔ سکھ تھوڑے تھے اور گاؤں والے زیادہ تھے۔ سکھ سب مارے گئے اور گاؤں والے قیدیوں کو اپنے ساتھ گاؤں میں لے گئے۔

گنواروں نے نرگس نظر کے جسم پر جو دو چار قیمتی زیور تھے' ان کو اتار لیا اور قیمتی کپڑے بھی اتروا لیے اور کسی چماری کا پھٹا ہوا لہنگا اور پھٹا ہوا کرتہ اور میلا دوپٹہ پہننے کو دے دیا۔ نرگس نظر نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا اور مجبوراً تن ڈھانپنے کو یہ کپڑے پہنے۔ تھوڑی دیر میں پاس کے گاؤں کے چند مسلمان گنوار آئے اور ان کے نمبر دار نے نرگس نظر کو گوجروں سے خرید لیا اور اپنے گاؤں میں لے گیا۔ یہ لوگ ذات کے رانگھڑ تھے اور کچھ لوگ نگا قوم کے مسلمان تھے۔ نمبر دار نے اپنے لڑکے کا پیغام دیا کہ تیری شادی اس کے ساتھ کر دیں۔ یہ بڈھا آدمی تھا اور اس کا لڑکا اگرچہ گنوار تھا' لیکن صورت شکل کا اچھا تھا۔ نرگس نظر نے ہاں کر لی اور گاؤں کے قاضی نے اس کا نکاح پڑھا دیا اور نرگس نظر تین چار مہینے نمبر دار کے گھر میں نئی دلہن بنی آرام سے بسر اوقات کرتی رہیں۔

دوسری مصیبت

انگریزوں کا قبضہ پوری طرح ہو گیا تھا اور ان کے جاسوس جگہ جگہ خبریں لیتے ہوئے پھر رہے تھے۔ کسی جاسوس نے دہلی کے حاکم کو خبر دی کہ میرزا باغی دستیاب نہیں ہوئے' مگر ان کی بیٹی فلاں گاؤں میں فلاں نمبر دار کے گھر میں موجود ہے۔ انگریز حاکم نے اس گاؤں میں پولیس کو بھیجا۔ میرٹھ کی پولیس نے آ کر گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور نرگس نظر اور ان کے خاوند اور سسرے کو گرفتار کر کے دہلی میں لایا گیا۔ حاکم نے نرگس نظر سے میرزا کے متعلق بہت سوالات کیے' مگر جب کوئی مفید مطلب جواب نہ ملا تو حکم دیا کہ نمبر دار اور اس کا بیٹا باغی معلوم ہوتے ہیں اور ان دونوں نے ایک باغی کی بیٹی کو پناہ دی ہے۔ اس واسطے ان دونوں کو جیل بھیج دیا جائے اور یہ عورت دہلی میں کسی مسلمان کے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ نمبر دار اور اس کا بیٹا دس دس سال کے لیے جیل بھیج دیئے گئے اور نرگس نظر سے پوچھا گیا کہ وہ کس کے ہاں رہنا چاہتی ہے۔ شہزادی نے جواب دیا اگر میرے خاندان کے آدمی دہلی میں ہوں تو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ معلوم ہوا تیمور یہ خاندان کے لوگ ابھی تک یا تو روپوش ہیں یا جنگلوں اور دیہات میں مقیم ہیں۔ دہلی شہر میں ابھی کوئی نہیں آیا۔ اس واسطے نرگس نظر ایک فوجی مسلمان سپاہی کے حوالے کر دی گئیں جوان کو اپنے گھر میں لے گیا۔ اس سپاہی کی بیوی موجود تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک

قبول صورت جوان عورت گھر میں آئی ہے تو اس نے ایک دو جھڑ اپنے خاوند کے مارا اور نرگس نظر کو بھی دھکا دے کر گھر سے باہر نکال دیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ نرگس نظر کو کسی نے دھکا دیا۔ سپاہی گھر کے باہر آیا اور نرگس نظر کو ساتھ لے کر اپنے ایک دوست کے ہاں لے گیا۔ وہ بڑی عمر کے ایک مسلمان تھے اور گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ انہوں نے شہزادی کا حال سنا تو رونے لگے اور بہت محبت کے ساتھ اپنے گھر میں جگہ دی اور نرگس نظر ایک رات آرام سے اس گھر میں رہیں۔

دوسری رات کو نرگس نظر سوتی تھیں کہ چند آدمیوں نے ان کا منہ اپنے ہاتھوں سے بند کیا اور اٹھا کر کہیں لے گئے۔ نرگس نظر نے ہر چند ہاتھ پاؤں مارے' مگر انہوں نے ایسا مضبوط پکڑا تھا کہ یہ جنبش نہ کر سکیں۔ وہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے جہاں کے نمبردار کے بیٹے سے نرگس نظر کا نکاح ہوا تھا' مگر وہ دہلی کے قریب ایک گاؤں میں لے گئے اور وہاں ایک چھپر میں ٹھہرایا اور ایک چارپائی سونے کے لیے دے دی۔ یہ گاؤں بھی نگا مسلمانوں کا تھا۔

نرگس نظر جس گھر میں رہتی تھیں' وہ نمبردار کا گھر تھا اور نمبردار بہت نیک چلن آدمی تھا۔ تین چار سال تک نرگس نظر اس گھر میں رہیں۔ وہ سارے گھر کا کام کرتی تھیں' لیکن کو برتھا پنا اور دودھ دوہنا ان کو نہ آتا تھا۔

چار سال کے بعد ان کا خاوند رہا ہو گیا اور وقت سے پہلے گورنمنٹ نے اس کو رہائی دے دی اور وہ نرگس نظر کو اس گاؤں سے اپنے گھر لے گیا۔ جہاں ساری عمر انہوں نے گذار دی اور ان کے کئی بچے ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں نرگس نظر کا انتقال ہو گیا۔

مصیبت کی ایک رات

نرگس نظر کہتی تھیں کہ جب میں دہلی کے قریب نگا نمبردار کے گھر میں رہتی تھی۔ اس زمانے کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم تھا اور مجھے بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ رات کے وقت بادل گرج رہا تھا' بجلی چمک رہی تھی اور میں اکیلی اپنے چھپر میں گاڑھے کی ایک میلی چادر اوڑھے کھری چارپائی پر لیٹی تھی۔ خواب میں دیکھا گویا جل محل میں سونے کے جڑاؤ چھپر کھٹ کے اندر لیٹی ہوں۔ جوئی اور چمپا اور مولسری کے پھول اور ریشمی تکیے میرے پاس ہیں اور گانے والی لڑکیاں دھیمے سروں میں گا رہی ہیں اور مجھے عجب لطف آ رہا ہے۔ اسی خواب کی حالت میں مَیں نے ایک گانے والی کو آواز دی کہ مسہری کا پردہ اٹھا اور مجھ کو سہارا دے کر بٹھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دوڑی ہوئی آئی اور اس نے مجھے گود میں لے کر اٹھایا اور اٹھانے میں شوخی سے ذرا مجھ کو دبا بھی دیا۔ میں نے اس کے ایک طمانچہ مارا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ مجھ کو اس خواب نے اور جل محل کی یاد نے بے قرار کر دیا اور میں چھپر کے دروازے پر گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے آ کر کھڑی ہو گئی۔ مینہ بہت زور سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو صحن کا پانی دکھائی دیتا تھا اور مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جل محل کے صحن میں کھڑی ہوئی ماہتاب اور عالم آب کا تماشہ دیکھ رہی ہوں۔

جب سے مصیبت کے دن آئے تھے۔ میں کبھی نہیں گھبرائی اور میں نے کبھی اچھے دنوں کو یاد نہیں کیا تھا' لیکن آج خبر نہیں کیا بات تھی کہ میں جل محل کو یاد کرتی تھی اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں شہنشاہ ہند کی پوتی ہوں اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں اپنے باپ کی لاڈلی ہوں اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں سترہ برس کی عمر تک شہزادی تھی اور آج ایک مفلس نادار

نوکرانی ہوں۔ میرے ہاں سارے قلعہ سے اچھے اور نفیس کپڑے تھے اور ہر چیز نہایت صفائی اور ستھرائی سے رکھی جاتی تھی اور یہی میرا رات دن کا مشغلہ تھا' مگر آج برعکس ہے۔ انا کے گھر میں جو زیور اور جواہرات دفن کرائے تھے' بعد میں اس کو خفیہ طور سے کھود کر دیکھا تو سب کچھ غائب تھا۔ خبر نہیں کون لے گیا۔ گویا پچھلے زمانے کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی۔ صرف میں باقی ہوں اور وہ بھی بدلی ہوئی اور ہر بات میں مٹی ہوئی۔

ان خیالات کا مجھ پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ مجھے غش آ گیا اور میں وہیں بیہوش ہو کر گر پڑی اور صبح تک بیہوش پڑی رہی۔ صبح ہوئی تو وہی میں تھی جس کو نگو کہہ کر سب پکارتے تھے اور وہی چولہا تھا جہاں میں روٹی پکاتی تھی اور وہی سب گھر کے کام تھے جو مجھے رات دن لونڈیوں سے بڑھ کر محنت کے ساتھ کرنے پڑتے تھے اور میں کہتی تھی:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

☆ ☆ ☆

کفنی

''دل شاد! گدگدیاں نہ کر' مجھے سونے دے۔ نماز قضا ہوتی ہے تو کیا کروں' آنکھ کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔''

''بیوی! گدگدیاں میں نے نہیں کیں۔ یہ گلاب کا پھول تمہارے تلووں سے آنکھیں مل رہا ہے۔''

''میں اس پھول کو مسل ڈالوں گی۔ اتنے سویرے مجھے کیوں جگاتا ہے۔ میرا دل ابھی سونے کو چاہتا ہے۔ ذرا سندری کو بلا۔ بانسری بجائے۔ ہلکے سروں میں بھیرویں سنائے۔ گل چمن کہاں ہے۔ چپی کرے۔ تو کوئی کہانی شروع کر۔''

''کہانی کہوں گی تو مسافر راستہ بھول جائیں گے۔ دن کو کہانی نہیں کہنی چاہئے۔ سندری حاضر ہے۔ گل چمن کو بلاتی ہوں۔ اماں جان آ جائیں گی تو خفا ہوں گی کہ مہ جمال کو اب تک بیدار نہیں کیا۔ نماز کا وقت جاتا ہے۔''

سندری بانسری بجا رہی تھی کہ مہ جمال نے آنکھیں کھول دیں۔ بالوں کو سمیٹا۔ مسکرائی۔ کلمہ پڑھا۔ نرگس نے سلام کیا۔ جواب میں اس کے ایک چٹکی لی گئی۔ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی اور کہا:

''دل شاد! ہم نے نرگس کے چٹکی لی تو یہ ہنسی نہیں۔ منہ بنالیا۔ آ تُو آ۔ تیرے کان مروڑوں اور تُو خوب ہنس۔''

دل شاد اٹھ کر بھاگی۔ دور کھڑی ہوئی اور کہا ''لیجئے میں کھل کھلا کر ہنستی ہوں۔ آپ مجھ لیجئے کان مروڑ دیئے۔''

مہ جمال نے پھر انگڑائی لی اور مسکراتی ہوئی طشت چوکی پر گئی۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ صحن میں نکلی۔ باغ کے پاس تخت پر بیٹھی۔ قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ سب لونڈیاں فرش کی درستی میں مصروف ہوئیں۔ ناشتے کا سامان کرنے لگیں۔

مہ جمال تلاوت سے فارغ ہوئی تو مالن چنگیر میں چند ہری مرچیں لیے حاضر ہوئی۔ پہلے مہ جمال کی بلائیں لیں۔ دعائیں دیں۔ پھر بولی ''سرکار آج حضور کے لگائے ہوئے پودوں میں یہ مرچیں لگی تھیں۔ نذر کے لیے لائی ہوں۔''

مہ جمال نے چنگیر لے لی۔ سب لونڈیوں کو پکارا اور مرچوں کی آمد سے محل میں ایک دھوم مچ گئی۔ نرگس نے کہا

''کیسی ہری ہری چکنی صورت ہے۔'' دل شاد بولی ''جیسے بیوی کے گال۔'' سندری نے کہا ''کیسی چپ چاپ چنگیر میں لیٹی ہیں جیسے بیوی چھپر کھٹ میں سوتی ہیں۔'' گل چمن بولی ''ڈالی سے ٹوٹی ہیں گھر سے چھوٹی ہیں۔ اس لیے ذرا چپ چپ ہیں۔''

مہ جمال نے کہا ''مالن کو جوڑا دو۔ کپڑے پہناؤ۔ پانچ روپے نقد بھی دینا۔ میرے درختوں کا پہلا پھل لائی ہے۔ اس کا منہ بھی میٹھا کرنا۔''

مالن کو ریشمی جوڑا ملا۔ چاندی کے کڑے پہنائے گئے۔ لڈو کھلائے گئے۔ پانچ روپے نقد اور ایک پان کا بیڑا ملا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھر گئی۔ یہاں اماں جان کو لونڈی خبر دینے پہنچی کہ بیوی کے درختوں کا پہلا پھل آیا ہے۔ وہ برابر کے مکان سے آئیں۔ مغلانی ساتھ تھیں۔ بیٹی کی بلائیں لیں۔ مہ جمال نے آداب کہا۔ اماں اور مغلانی نے مرچوں کی خوب تعریفیں کیں اور تھوڑی دیر تک مرچوں کا غلغلہ گھر میں برپا رہا۔

مہ جمال خورشید جمال کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والد میرزا علی گوہر عرف نیلی شاہ عالم کے بیٹے اکبر شاہ ثانی کے بھائی تھے جو مر چکے تھے۔ خواصوں سے ان کے کئی بچے تھے مگر بیگم سے صرف جمال ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی اور وہ بھی بڑھاپا آ جانے کے بعد۔ جب میرزا نیلی مرے ہیں تو مہ جمال کی عمر پانچ سال کی تھی۔ اب ماشاءاللہ پندرہویں سال میں ہے۔ صورت سانولی ہے۔ چہرہ کتابی ہے۔ قد میانہ ہے۔ آنکھیں سیاہ اور بے حد رسیلی اور مخمور ہیں۔ آواز میں قدرتی درد ہے۔ جب ہنس کر بولتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرثیہ پڑھا گیا۔ سن کر کلیجے پر چوٹ لگتی ہے۔ وہ بہت چنچل، شوخ، آرام طلب اور نازک مزاج ہے۔ لاڈ پیار میں پلی ہے۔ شہزادی ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی ہے اور کچھ فطرتاً ضدی اور ہٹیلی ہے۔ بدن بہت دبلا ہے۔ چلتی ہے تو غیر مصنوعی انداز سے بدن کو جھکاتی۔ پھولوں کی ٹہنی کی طرح اِدھر اُدھر جھکولے کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ ٹھوکریں قدم قدم پر لگتی ہیں۔ لونڈیاں ساتھ دوڑتی ہیں۔ بسم اللہ یا اللہ خیر کہتی جاتی ہیں۔

پھول والوں کی سیر

بہادر شاہ اپنے نئے ظفر محل میں جو درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے دروازے کے قریب بنا تھا، تشریف رکھتے تھے۔ بیگمات اندر تھیں، مگر خورشید جمال اور مہ جمال نے دوسرا مکان لیا تھا، کیونکہ میرزا نیلی کے وقت سے ان کی اور بہادر شاہ کی ان بن تھی۔ بہادر شاہ کو انگریز لاکھ روپے مہینہ دیتے تھے۔ اس میں سے ایک ہزار روپے مہینہ خورشید جمال کا علیحدہ بھیج دیا جاتا تھا۔ سستا سماں تھا۔ ہزار روپے آج کل کے لاکھ روپے کے برابر تھے اور خورشید جمال خوب عیش آرام سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ جس شام کو پنکھا چڑھا، مہ جمال عصر کے وقت سے برآمدے میں چلمن کے پاس بیٹھی تھی۔ نفیری بج رہی تھی۔ دہلی کے ہندو مسلمان زرق برق کپڑے پہنے پنکھے کے ساتھ تھے۔ دکانیں آراستہ تھیں۔ سقے کٹورے بجا رہے تھے۔

مغرب کا وقت آیا تو خورشید جمال نے لونڈیوں سے کہلا بھیجا کہ پہلے آن کر نماز پڑھ لو پھر تماشا دیکھنا۔ مہ جمال اٹھی تو چلتے وقت اس نے دیکھا، ایک فقیر سفید کفنی پہنے زرد چہرہ، ننگے سر ننگے پاؤں پنکھے کے پاس سے گذر کر اس کو دیکھتا ہوا

چلا گیا۔ اس کی صورت اور کفنی دیکھ کر مہ جمال ڈر گئی۔ نماز میں بھی اسی کا خیال رہا۔ سیر سے فارغ ہو کر سوئی تو رات کو بھی کفنی کئی دفعہ خواب میں دکھائی دی۔ صبح ہوئی تو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ماں کو خبر ہوئی اس نے کچھ پڑھ کر دم کیا۔ صندوقچے سے ایک نقش نکال کر گلے میں ڈالا۔ فقیروں کو خیرات بھجوائی۔

دوپہر کو بخار تیز ہو گیا۔ مہ جمال چونکتی تھی اور کہتی تھی "وہ کفنی والا آیا۔ وہ مجھ کو بلاتا ہے۔ اماں جی آنا۔ وہ دیکھو کھڑا مسکراتا ہے۔"

ماں نے لونڈیوں سے پوچھا۔ انہوں نے کہا "ایک فقیر کل شام کو کفنی پہنے جاتا تھا۔ بیوی نماز کے لیے اٹھیں تو چلمن کا پردہ ہٹ گیا۔ فقیر نے ان کو گھور کر دیکھا اور بیوی نے اس کو دیکھا۔ اس کے بعد وہ کہیں چلا گیا۔"

خورشید جمال نے نوکروں کو حکم دیا کہ اس حلیہ کا فقیر جہاں ملے اس کو لاؤ۔ نوکر سارے میلے میں ڈھونڈتے پھرے۔ شام کو وہ فقیر ملا۔ اس کو ساتھ لے کر مکان پر آئے۔ خورشید جمال نے پردے کے پاس بٹھا کر لڑکی کا حال کہا۔ وہ بولا "مجھے اندر لے چلو۔ میں دم کر دوں گا۔ اچھی ہو جائیں گی۔"

خورشید جمال نے اندر پردہ کرایا۔ فقیر کو پلنگ کے پاس کھڑا کیا۔ اس نے آنکھ بند کر کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے اور کچھ دیر چپ کھڑا رہا اور پھر کہا "لوڑکی اچھی ہو گئی۔"

دیکھا تو واقعی بخار اتر گیا تھا۔ مہ جمال اٹھ بیٹھی۔ خورشید جمال اور سب لونڈیاں حیران ہو گئیں۔ فقیر کو بٹھایا۔ کچھ روپے اور کپڑے کے دو تھان نذر پیش کیے۔ فقیر نے کہا "یہ میں نہیں لیتا۔ مجھے لڑکی کی صورت دکھا دو۔ ورنہ پھر بیمار ہو جائے گی۔"

خورشید جمال نے پہلے تو کچھ تامل کیا۔ پھر خیال آیا کہ فقیر تو ماں باپ ہوتے ہیں۔ پردہ ہٹایا۔ مہ جمال نے فقیر کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ فقیر نے مہ جمال کو دیکھا اور برابر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد "بھلا ہو بابا" کہہ کر اٹھا اور چلا گیا۔

یہ تیس برس کا جوان تھا، مگر بیمار معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر زردی بہت زیادہ تھی۔ سفید کفنی کے سوا کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا روتے روتے سوج گئی ہیں۔

یہ شخص اس مالن کا بیٹا تھا جو مہ جمال کے باغ کی محافظ تھی۔ مہ جمال کو ایک سال پہلے اس نے باغ میں دیکھا تھا۔ اپنی غریبی اور مہ جمال کی شان کا خیال کر کے اس کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس تکلیف کو کسی کے سامنے بیان کرے جو مہ جمال کے دیکھنے سے خود بخود اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

چھ مہینے وہ اس خلجان میں پریشان رہا۔ اس کے بعد اس کو ایک ہندو جوگی ملا جس سے اس نے اپنا حال بیان کیا۔ جوگی نے ایک سفید کفنی دی کہ اس کو پہن لے "تیرے سب کام پورے ہو جائیں گے۔" کفنی پہنتے ہی وہ نیم مجذوب ہو گیا اور گھر بار چھوڑ کر جنگل میں نکل گیا۔ چھ مہینے تک جنگلوں میں پھرتا رہا۔ چھ ماہ کے بعد اب وہ پھر آبادی میں آیا تھا جہاں اس نے پھر مہ جمال کو دیکھا، مگر اب اس کے دیکھنے میں ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ مہ جمال کو اس نے ایک نگاہ میں بیمار کر دیا۔

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایک رتھ نجف گڑھ کے قریب کھڑا تھا اور خاکی وردی کے فوجی سپاہی اس کو گھیرے ہوئے

تھے۔ یہ سب لشکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس رتھ میں خورشید جمال' مہ جمال اور دو لونڈیاں سوار تھیں۔ باہر چار نوکر تلواریں لیے کھڑے تھے۔ فوج والے کہتے تھے ہم اندر کی تلاشی لیں گے۔ اس میں کوئی باغی پوشیدہ ہے۔ بیگم کے نوکر کہتے تھے۔ اندر عورتیں ہیں۔ ہم پردہ نہ کھولنے دیں گے۔ نوبت لڑائی کو پہنچی۔ نوکروں نے تلوار چلائی اور وہ سب ایسے لڑے کہ ایک بھی زندہ نہ بچا۔ فوجیوں نے رتھ کا پردہ الٹ دیا۔ عورتوں کو دیکھا اور زیور کا صندوقچہ ان سے چھین لیا۔ اس کے علاوہ اور جس قدر اسباب تھا' وہ بھی لوٹ کر آگے بڑھ گئے۔ رتھ بان بھاگ گیا تھا۔ بیگم لونڈیوں کو لے کر نجف گڑھ کی طرف چلیں کہ اتنے میں چند گوجر لٹھ لیے ہوئے آئے اور ان سے زیورات اور کپڑے مانگنے لگے۔ بیگم نے کہا ہم کو تو فوج والوں نے لوٹ لیا ہے۔ اب ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ تم رتھ اور بیل لے لو' مگر گوجر نہ مانے اور انہوں نے زبردستی ان کے برقعے اتار ڈالے۔ سب فالتو کپڑے چھین لیے۔ خورشید جمال اور لونڈیوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ ایک گوجر نے خورشید جمال کے سر پر لکڑی ماری اور دوسرے نے لونڈیوں پر لکڑیوں کے وار کیے۔ مہ جمال ذری سہمی چپ کھڑی تھی۔ اس کو کسی نے نہ چھیڑا۔ خورشید جمال کا سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر مر گئیں۔ لونڈیاں بھی دونوں چوٹ کے صدمے سے تمام ہو گئیں۔ مہ جمال اکیلی کھڑی تماشہ دیکھتی تھی۔ ماں کو مرتے دیکھا تو چپٹ کر رونے لگی۔ گوجر تو مار کوٹ کر چلے گئے اور مہ جمال روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

ہوش آیا تو اس نے دیکھا نہ اس کی ماں کی لاش ہے' نہ لونڈیوں کی لاشیں ہیں' نہ وہ جنگل ہے' بلکہ وہ ایک گھر کے اندر چارپائی پر لیٹی ہے۔ سامنے ایک گائے بندھی کھڑی ہے۔ چند مرغیاں صحن میں پھر رہی ہیں اور ایک میواتی چالیس پچاس برس کی عمر کا سامنے بیٹھا اپنی بیوی سے باتیں کر رہا ہے۔ مہ جمال کو پھر رونا آ گیا اور اس نے میواتی کی بیوی سے مخاطب ہو کر پوچھا "میری اماں کہاں گئیں؟" میواتن نے کہا "وہ مر گئی تھیں۔ ان کو دفن کر دیا گیا۔ تم کو یہاں لائے ہیں۔ تم کچھ کھاؤ گی۔ لو کھیر پکی ہے کھا لو۔"

مہ جمال نے کہا "مجھے بھوک نہیں ہے اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میواتن پاس آ گئی اور اس نے دلاسا دینا شروع کیا اور کہا "بیٹی صبر کرو۔ رونے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تیری ماں زندہ نہیں ہو سکتی۔ ہمارے اولاد نہیں ہے۔ بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ اس گھر کو تو اپنا گھر سمجھ۔ تو کون ہے تیرا باپ کہاں ہے اور تو کہاں جاتی تھی؟"

مہ جمال نے کہا "میں دلی کے بادشاہ کے خاندان سے ہوں۔ میرے ابا جان گیارہ برس ہوئے مر گئے۔ ہم غدر کی بھاگڑ میں گھر سے نکلے تھے۔ نجف گڑھ میں ہمارے باغ کا مالی رہتا ہے۔ اس کے گھر میں جانا چاہتے تھے کہ راستے میں پہلے فوج والوں نے لوٹا پھر گوجروں نے۔ اماں جان اور دو لونڈیوں کو مار ڈالا۔" یہ کہتے کہتے وہ پھر رونے لگی۔

چند روز مہ جمال میواتن کے ہاں آرام سے دن گذارتی رہی' اگرچہ وہ پچھلے وقت کو یاد کر کر کے روتی تھی' لیکن میواتن کی محبت کے سبب اس کو کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ پکی پکائی روٹی مل جاتی تھی۔ تاہم مہ جمال کو یہ گھر اور اس کی سادگی کاٹے کھاتی تھی اور وہ پچھلے زمانے کا عیش یاد آتا تھا۔

ایک رات کو مہ جمال اور میواتن اور اس کا خاوند اپنے مکان میں سوتے تھے کہ پڑوس کے ایک چھپر میں آگ لگ گئی اور وہاں سے بڑھ کر ان کے چھپر میں بھی آن لگی۔ دھوئیں کی بو سے مہ جمال کی آنکھ کھل گئی اور چیختی ہوئی اٹھی۔

میواتن اور میواتی کا کچھ زیور گھر کے اندر رکھا تھا۔ وہ اس کو لینے کے لیے اندر بھاگے اور مہ جمال گھر کے باہر بھاگی۔ کوٹھے کا جلتا ہوا چھپر گر پڑا اور وہ دونوں اس کے اندر جل کر مر گئے۔ قصبے والوں نے بمشکل آگ بجھائی مگر مہ جمال کا یہ ٹھکانا بھی خاک کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔

صبح جلی ہوئی لاشیں قصبے والوں نے دفن کیں اور مہ جمال کو ایک نمبردار اپنے گھر میں لے گیا۔ اس کے کئی بچے اور دو بیویاں تھیں۔ مہ جمال کو ایک چار پائی سونے کو دے دی گئی۔ وہ دن تو گزر گیا۔ رات کو ایک بیوی نے کہا "اری لڑکی دودھ چولہے پر رکھ دے۔" دوسری بولی "ادھر آ۔ میرے بچے کو سلا دے۔" ایک وقت میں دو حکم سن کر مہ جمال ذرا گھبرا گئی۔ اس نے نہ کبھی دودھ چولہے پر رکھا تھا نہ کسی بچے کو لوریاں دے کر سلایا تھا۔ تاہم وہ دودھ اٹھا کر چولہے پر رکھنے چلی۔ چولہے کے قریب آ کر ٹھوکر لگی ہانڈی ہاتھ سے گر پڑی اور ٹوٹ گئی۔ دودھ سب بکھر گیا۔ آواز سن کر نمبردار کی بیوی دوڑ کر آئی اور دودھ گرا ہوا دیکھ کر ایک دوہتڑ مہ جمال کے مارا اور گالیاں دینی شروع کیں۔

مار کھانے اور گالیاں سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مہ جمال کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دودھ اس کے کپڑوں پر بھی گرا تھا۔ کبھی وہ کپڑوں کو دیکھتی اور کبھی نمبردار کی بیوی کو دیکھتی تھی جو لگاتار گالیاں بک رہی تھی۔

آخر وہ دیوار کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ مہ جمال کو روتا دیکھ کر نمبردار کی بیوی کو پھر غصہ آیا اور اس نے جوتی نکال کر دو تین جوتیاں اس کے چہرے پر ماریں اور کہا "اب تو مجھ کو رو کر ڈراتی ہے۔ موئی ڈائن میواتن کو کھا گئی ہے۔ اب یہاں کس کو کھانے آئی ہے۔ میرا سارا دودھ پھینک دیا۔ خدا رکھے میرے بچوں کو۔ دودھ کا چولہے کے سامنے گرنا بڑا منحوس ہوتا ہے۔ خبر نہیں تیرا آنا کیا مصیبت لائے گا۔"

مہ جمال کے چہرے پر جوتیاں پڑیں تو وہ بلبلا اٹھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اتنے میں نمبردار آ گیا اور اس نے جو یہ شور و غل سنا تو وہ بھی وہاں آیا۔ مہ جمال وہاں سے بھاگ کر اپنی چار پائی کے پاس آ گئی۔ نمبردار اور اس کی بیوی بھی دالان میں آئے۔ نمبردار نے بیوی سے پوچھا "کیا ہوا تھا؟" اس نے سارا قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا "چلو خیر جانے دو۔ غریب عورت ہے۔ خطا ہو گئی۔ کچھ خیال نہ کرو۔" دوسری بولی "یہ غریب نہیں ہے۔ بڑی قطامہ ہے۔ میں نے آواز دی کہ ذرا بچے کو سلا دے تو کانوں میں بول مار کر چپ ہو گئی اور سنی ان سنی کر دی۔ اس کو تم بیگم بنا کر لائے ہو یا نوکر بنا کر۔ نوکر ہے تو اس کو کام کرنا پڑے گا۔"

نمبردار نے کہا "میں تو لاوارث سمجھ کر لایا ہوں۔ اس کو کام کرنا چاہئے۔ ہم کو ایک نوکر عورت کی ضرورت بھی تھی۔"

مہ جمال نے ڈرتے ڈرتے کہا "مجھ کو آج تک نوکری کرنی نہیں آتی تھی۔ تم مجھ کو سکھا دو۔ تقدیر نے یہ وقت مجھ پر ڈالا مگر نوکری کرنی نہ سکھائی۔ میرے سامنے تو لونڈیاں کام کرتی تھیں۔ میں نے تو کبھی کچھ کام نہیں کیا۔" یہ کہتے کہتے اس کو ایسا رونا آیا کہ ہچکی بندھ گئی۔

نمبردار نے کہا "تو رو مت۔ رفتہ رفتہ سب کام آ جائے گا۔" اس کے بعد کچھ کھانے کو دیا مگر مہ جمال سے کھایا نہ گیا اور وہ یونہی پڑ کر سو گئی۔ صبح کو نمبردار کی بیوی نے زور سے جھنجھوڑا اور کہا "اری اٹھتی نہیں۔ کب تک سوئے گی۔ جھاڑو

دینے کا وقت ہے۔"

مہ جمال کو یاد آیا کہ دل شاد، نرگس، سندری کس طرح جگایا کرتی تھیں۔ یا وہ وقت تھا یا یہ وقت ہے۔ ٹھنڈا سانس لے کر اٹھی اور حسب عادت دو چار انگڑائیاں لیں۔

نمبردار کی بیوی نے دھکا دے کر کہا "نحوست پھیلاتی ہے، اٹھتی نہیں۔" اس وقت مہ جمال نے جانا کہ اب میں واقعی لونڈی بن گئی ہوں۔ شہزادی نہیں رہی۔ فوراً اٹھی، مگر آنسو لگا تار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ نمبردار کی دوسری بیوی نے کہا "اس عورت کا گذر ہمارے گھر میں نہ ہوگا۔ ہر وقت روتی ہے۔ بال بچوں کے گھر میں اس منحوس کا رکھنا اچھا نہیں۔" اتنے میں نمبردار آ گیا اور اس نے بیویوں کے کہنے سے مہ جمال کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔

مہ جمال حیران پریشان کھڑی تھی اور کہتی تھی "یا اللہ کدھر جاؤں۔" اتنے میں اس کو اپنی مالن کا خیال آیا کہ وہ اسی قصبے میں رہتی تھی اور اماں اسی کے ہاں ٹھہرنے کو گھر سے آئی تھیں۔

مہ جمال یہ خیال کر ہی رہی تھی کہ اتنے میں وہی کفنی والا فقیر سامنے سے آیا اور مہ جمال کو دیکھ کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ مہ جمال پر بھی اس ناگہانی ملاقات کا بہت اثر ہوا اور وہ بھی کچھ گم سم سی ہو گئی۔ اگرچہ وہ ایسی مصیبت کے حال میں تھی کہ اس کو تن بدن کا ہوش نہ تھا، تاہم فقیر اور اس کی کفنی اور اس کی زرد صورت اور لال لال آنکھوں کا ایسا اثر اس پر ہوا کہ تمام بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

فقیر نے کہا "میری ملکہ تم یہاں کہاں؟" مہ جمال نے میری ملکہ کا لفظ سنا تو لحاظ سے منہ پھیر لیا اور کہا "مجھ کو تقدیر یہاں لے آئی ہے۔" اور پھر سارا قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا "میرا گھر تو قریب ہے، مگر میں نے کبھی آپ کا حال نہ سنا۔ چلیے میرے گھر پر چلیے۔"

مہ جمال اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ وہ اپنے گھر میں گیا اور مالن سے مہ جمال کا حال کہا۔ وہ دوڑی ہوئی آئی اور مہ جمال کے قدموں میں گر پڑی اور پروانوں کی طرح اس پر صدقے قربان ہونے لگی۔ اس کے بعد بڑی عزت سے چارپائی پر لے جا کر بٹھایا اور حالات پوچھتی رہی اور کہا "بیگم! یہ گھر آپ کا ہے۔ میرے بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کے گھر کی بدولت خدا نے مالا مال کر رکھا ہے۔ اب آپ اس گھر کی مالک ہیں۔ میں اور میرا بیٹا آپ کا غلام ہے۔"

مالن نے اپنی حیثیت کے موافق اس قدر آرام مہ جمال کو پہنچایا کہ وہ مصیبتوں کو بھول گئی۔ اس نے دیکھا کہ مالن کے لڑکے کے پاس دور دور سے بیمار آتے ہیں اور وہ پہلے اپنی کفنی پر ہاتھ ملتا ہے پھر اپنے دونوں رخساروں پر ان کو رکھتا ہے اور آنکھیں کچھ دیر بند رکھ کر پھر کھول دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "جاؤ تم اچھے ہو۔" سب بیمار آن کی آن میں اچھے ہو جاتے ہیں۔

مہ جمال کئی روز تک یہ تماشا دیکھتی رہی تو اس نے مالن سے پوچھا "تیرے لڑکے میں یہ طاقت کہاں سے آ گئی۔ اس نے مجھ کو بھی ایک دن اسی طرح اچھا کر دیا تھا۔"

مالن نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بیوی جان کی امان پاؤں تو کہوں۔" مہ جمال نے کہا "اب میں جان کی امان دینے کے قابل نہیں ہوں۔ تم کہو مجھے اس بھید کے معلوم کرنے کا شوق ہے۔"

مالن نے کہا "بیگم میرے لڑکے کو تم سے محبت ہوگئی تھی اور تمہارے فراق میں اس نے بہت دکھ اٹھائے۔ آخر ایک فقیر نے اس کو یہ کفنی دی۔ یہ اسی کی برکت ہے۔ جس سے ہزاروں کو فیض پہنچ رہا ہے اور خدا نے گھر بیٹھے تم کو بھی یہاں بھیج دیا۔"

مہ جمال پر اس خبر کا بہت اثر ہوا اور کچھ دن کے بعد اس نے مالن سے کہہ کر قاضی کو بلوایا اور کفنی پوش سے نکاح کر لیا۔

مالن نے تمام عمر مہ جمال کی ایسی خدمت کی اور ایسی محبت سے اس کو رکھا کہ وہ کہتی تھی کہ "مجھ کو اپنا بچپن بھی یاد نہیں آتا۔"

مگر مالن کے لڑکے نے کفنی پہننی کبھی ترک نہ کی اور اس کفنی کا فیض دور دور مشہور ہو گیا اور اس طرح مہ جمال کی سوئی قسمت کفنی نے جگا دی۔

☆ ☆ ☆

میرزا مغل کی بیٹی لالہ رُخ

غدر ۱۸۵۷ء میں جب باغی فوجیوں نے بہادر شاہ بادشاہ کے مضبوط اور بہادر لڑکے میرزا مغل کو اپنا کمانڈر انچیف بنا لیا اور مرزا مغل عملاً باغیوں کی سرداری کا کام انجام دینے لگے تو ایک دن انچاس انگریز مرد بچے بوڑھے دہلی کے لال قلعے میں باغی فوج کی شرارت سے قتل کیے گئے۔ جس وقت ان انگریز مردوں اور عورتوں اور بچوں کو دیوان خاص کے سامنے قتل کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا ہے تو مرزا مغل اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے مقتل کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کی آٹھ برس کی لڑکی لالہ رخ بھی پاس کھڑی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ انگریزوں کے بچے بھی قتل گاہ میں لا کر کھڑے کیے گئے اور ان بچوں نے بلبلا کر رونا شروع کیا اور ان کی مائیں گھٹنے ٹیک کر خدا سے دعا مانگنے لگیں اور انہوں نے اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا کر زار و قطار رونا شروع کیا تو اس وقت وہ اور کوئی دوسرا آدمی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ سے آنسو جاری نہ ہوں۔ مرزا مغل کے چند مصاحب جو ان کے پاس کھڑے تھے، خصوصاً ان کی لڑکی لالہ رخ کے استاد مولانا معین اللہ صاحب آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "صاحب عالم! یہ تو بڑی سفاکی کا کام ہے۔ عورتوں اور بچوں کا قتل کس مذہب میں روا نہیں ہے اور اسلام نے تو سختی سے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ للہ آپ فوج کو حکم دیجیے کہ وہ ان عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرے۔" مرزا مغل نے جواب دیا کہ "بیشک یہ بہت بڑے ظلم و ستم کی بات ہے، مگر فوج کے جاہل سپاہیوں اور غصے میں بھرے ہوئے افسروں کو روکنا اور اس برے کام سے باز رکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ لوگ بالکل جنگلی اور وحشی ہیں اور انگریزوں سے باغی ہونے کے بعد اتنے خود سر اور بے بہرہ ہو گئے ہیں کہ کسی شخص کا حکم نہیں مانتے۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔"

مولانا معین اللہ صاحب نے کہا "صاحب عالم کو تو انہوں نے اپنا بڑا سپہ سالار بنا لیا ہے اور جہاں پناہ ظل سبحانی اعلیٰ حضرت بادشاہ سلامت کو یہ اپنا حکمران تسلیم کر چکے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ آپ کا اور آپ کے والد بادشاہ سلامت کا

حکم نہ مانیں۔ آپ کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ان انگریز عورتوں اور بچوں کے رونے اور آہ و زاری کرنے سے آسمان وزمین کانپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

مرزا مغل نے جواب دیا "مولانا! میں اور میرے والد نام کے کھلونے بنادیئے گئے ہیں۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نہ میرا کوئی کہنا مانتا ہے نہ بادشاہ سلامت کا۔ جب یہ انگریز عورت مرد گرفتار ہو کر آئے تو میں نے اسی مصلحت سے قلعہ میں حضرت بادشاہ سلامت کے پاس بھجوادیا تھا کہ کسی صورت سے ان عورتوں اور بچوں کی جان بچالوں، مگر ان ظالم باغیوں نے قلعہ کے اندر بھی ان بیچارے انگریز عورتوں اور مردوں کو اپنی گرفت کے اندر رکھا اور بادشاہ سلامت کے اثر کو کسی طرح قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ جب میرے کہنے سے دو ایک مرتبہ بادشاہ سلامت نے مکلف کھانے ان بے کس قیدیوں کو اپنے خاصے سے بھجوانے چاہے تو باغی مزاحم ہوئے اور بڑی مشکل سے ان قیدیوں کو وہ کھانا دینے پر رضامند ہوئے۔ ان کا اس وقت سے یہ خیال ہے کہ بادشاہ سلامت اور ان کی اولاد انگریزوں سے ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر منہ پھٹ سپاہیوں نے میرے اور جہاں پناہ کے منہ در منہ کہا ہم نے اپنی جانوں کو اور سارے گھربار کو تباہی میں ڈال دیا ہے مگر آپ اس کی کچھ قدر نہیں کرتے اور بات بات میں انگریزوں کی رعایت کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگ اس سے باز نہ آئے تو پہلے ہم آپ سب لوگوں کا تلوار سے صفایا کریں گے۔ مولانا! تمہیں انصاف کرو! ایسی جنگلی اور وحشی فوج سے کیونکر سفارش کی جاسکتی ہے۔ اگر اس وقت میں ان لوگوں کو عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع کروں تو یہ پہلے مجھ کو اور میرے بچوں کو اسی مقام پر لے جا کر قتل کردیں گے جہاں ان بیچارے انگریز قیدیوں کو ہلاکت کے ارادے سے لے کر گئے ہیں۔"

مولانا عین اللہ نے فرمایا کہ "صاحب عالم کی یہ مجبوری حق بجانب ہے مگر اسلام حکم دیتا ہے کہ مظلوم کی حمایت کے لیے اپنی جان تک کی بھی کچھ پروانہ کرنی چاہیے۔ دنیا چند روزہ ہے۔ چلیے میرے ساتھ چلیے۔ میں خود جا کر ان باغیوں کو نصیحت کروں گا۔

مرزا مغل نے اس کا جواب تو نہ دیا مگر ان کے چہرے کے تذبذب اور سکوت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس خیال پر کچھ آمادہ ہونا چاہتے ہیں، مگر قبل اس کے کہ وہ ایک لفظ اپنی زبان سے نکالتے، ایک شخص نے جو مرزا کے مصاحبوں کے پیچھے کھڑا ہوا تھا، دوڑ کر مولانا عین اللہ صاحب کی پیٹھ میں ایک چھری ماری اور الٹے پاؤں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ کافروں اور کافروں کے دوستوں کی یہی سزا ہے۔ مرزا مغل کے مصاحب اور خود مرزا مغل مولانا عین اللہ کو سنبھالنے لگے اور دو ایک آدمی قاتل کے پیچھے دوڑے تا کہ اس کو گرفتار کریں، مگر قاتل کوٹھے سے نیچے اتر کر دوڑا اور باغی سپاہیوں کے جھرمٹ میں جا کر چھپ گیا۔

چھری مولانا عین اللہ کے بائیں پہلو پر لگی تھی، جس نے پسلیوں کو چیر کر گردوں کے دو ٹکڑے کر دیئے اور بیچارے مولانا گرتے ہی رحلت کر گئے اور ایک بات بھی ان کے منہ سے نہ نکلنے پائی۔

لالہ رخ گو بچہ تھی، مگر اپنے استاد کا یہ حال دیکھ کر پہلے تو کچھ خوفزدہ ہوگئی اور اس کے بعد ہائے میرے مولوی صاحب کہہ کر رونا شروع کر دیا۔

باغی فوجیں بھاگ گئیں۔ انگریزی فوج نے دہلی فتح کر لی۔ بہادر شاہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو

گئے۔ مرزا مغل، مرزا ابوبکر وغیرہ فاتح فوج کے ہاتھوں اسیر ہو کر قتل کر دیئے گئے۔ اس وقت لالہ رخ اپنی والدہ کے ساتھ جو مرزا مغل کی ایک منظور نظر لونڈی تھی، بیل گاڑی میں سوار جنگل میں جا رہی تھی۔ گاڑی میں ایک لالہ رخ، ایک اس کی ماں اور ایک خانم نام کی ماما کل تین عورتیں تھیں اور دو مرد۔ مردوں میں ایک مرزا گھسیٹا تھے، جن کی دور کی قرابت شاہ عالم بادشاہ سے ہوتی تھی اور دوسرے مرزا مغل کی ڈیوڑھی کے داروغہ قدرت خاں تھے۔ گاڑی قطب صاحب کی درگاہ سے آگے بڑھ کر چھتر پور کے قریب پہنچی تھی کہ سامنے سے چند سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ ان لوگوں نے سمجھا کہ انگریزی فوج آ گئی اس واسطے انہوں نے گاڑی کو راستے سے بالکل ہٹا لیا اور چاہا کہ درختوں کی آڑ میں چھپ جائیں، مگر گاڑی دس قدم بھی نہ بڑھنے پائی تھی کہ سوار قریب پہنچ گئے اور انہوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ لالہ رخ نے دیکھا ان سواروں میں وہ شخص بھی ہے جس نے مولانا عین اللہ کو شہید کیا تھا۔ اس وقت اس نے چپکے سے اپنی ماں کے کان میں کہا "یہ انگریزی فوج نہیں ہے بلکہ باغی فوج ہے۔" سواروں نے گاڑی کو روک لیا اور کہا "جو کچھ مال تمہارے پاس ہو ہمیں دے دو۔" مرزا گھسیٹا نے ایک باغی سپاہی کو پہچان کر کہا "تم کو تو ہماری مدد کرنی چاہیے نہ کہ الٹا ہم کو لوٹو۔" اس پر مولانا عین اللہ کے قاتل نے کہا "تم لوگ مدد کے قابل نہیں ہو، کیونکہ تمہاری مخبریوں نے انگریزوں کو فتح دلوائی اور ہم کو بھاگنا پڑا۔" داروغہ قدرت خاں نے جواب دیا "بالکل جھوٹ ہے۔ تمہیں لوگوں نے ہماری اطاعت نہ کی اور اتنی بڑی طاقت کے باوجود بھاگ کھڑے ہوئے اور ہمارا عیش و آرام اور گھر بار برباد کر دیا۔" یہ فقرہ سن کر باغی سوار بے تاب ہو گئے اور غضبناک ہو کر انہوں نے گاڑی بان اور مردوں پر تلواریں مارنی شروع کیں۔ چنانچہ مرزا گھسیٹا، داروغہ قدرت خاں اور گاڑی بان اسی جگہ مارے گئے اور بیچاری خانم بھی قدرت خاں کے بچانے میں تلوار کھا کر گر پڑی اور جان سے گئی۔ صرف لالہ رخ اور اس کی ماں زندہ بچیں۔

باغیوں نے گاڑی کا سب اسباب لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ مقتولوں کے کپڑے بھی اتار لیے۔ لالہ رخ کی والدہ کے پاس جتنا زیور تھا، وہ بھی چھین لیا گیا اور لالہ رخ کے کانوں میں اور گلے میں جو گہنا تھا، وہ بھی زبردستی اتار لیا۔ اس کے بعد آپس میں مشورے کرنے لگے کہ ان دونوں کو کون لے۔ ایک سوار نے کہا "عورت جوان ہے، اس سے میں شادی کروں گا۔ اس کو مجھے دے دو۔ اور اس کے عوض میرے حصے کا زیور لے لو۔" مولانا عین اللہ کا قاتل بولا "اس لڑکی کو میں لوں گا کیونکہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔" چنانچہ اس مشورے پر عمل کیا گیا اور لالہ رخ کی والدہ کو ایک سوار نے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا اور لالہ رخ کو مولانا عین اللہ کے قاتل نے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ لالہ رخ "اماں اماں" کہہ کر رونے لگی تو لالہ رخ کی ماں نے اس سوار سے کہا کہ "میری لڑکی کو بھی تو لے لے تاکہ ہم دونوں ایک جگہ رہیں۔" اس سوار نے کہا میں بھرت پور کا رہنے والا ہوں اور وہاں تجھ کو لے جاؤں گا اور یہ سوار جس کے حصے میں تیری لڑکی آئی ہے، سوہنہ ضلع گوڑگانوہ کا رہنے والا ہے۔ ہم اپنے آپس کی تقسیم کو بدلنا نہیں چاہتے۔" لالہ رخ کی ماں نے کہا "اللہ مجھ پر رحم کرو اور اکلوتی بچی کو مجھ سے نہ چھڑاؤ" مگر ان ظالموں کو ذرا رحم نہ آیا اور بھرت پوری سوار لالہ رخ کی ماں کو لے کر بھرت پور چلا گیا اور مولانا عین اللہ کا قاتل لالہ رخ کو لیے ہوئے سوہنہ پہنچ گیا۔

لالہ رخ کا بیان ہے کہ جب میری والدہ مجھ سے جدا ہو کر چلیں تو وہ اپنے بال نوچتی تھیں اور دھاڑیں مار مار کر روتی تھیں اور میں بھی "اماں اماں" کہہ کر چیختی تھی، مگر ان ظالموں کو ہم میں سے کسی کی فریاد پر بھی رحم نہ آتا تھا۔ مجھ کو جب

تک اماں کا گھوڑا نظر آتا رہا' ان کو چیخ چیخ کر پکارتی رہی' لیکن جب گھوڑا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو میں چپ ہو گئی۔ سونپت میں پہنچ کر وہ شخص مجھ کو اپنے مکان میں لے گیا۔ وہ ذات کا گھوسی تھا۔ اس کے گھر میں تین چار بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کی بیوی نے جب مجھ کو دیکھا اور خاوند سے یہ سنا کہ وہ مجھ کو بیٹی بنانے کے لیے لایا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے مجھ کو پیار محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔ آٹھ دن تک اس گھوسن نے میری ایسی خاطر کی کہ میں اپنی ماں کی جدائی کے غم کو بھول گئی۔ آٹھ دن کے بعد یکا یک انگریزی فوج آئی اور اس نے میرے موجودہ باپ کو پکڑ لیا اور گھر کا تمام مال و اسباب ضبط کر کے لے گئی۔ مجھ کو میری گھوسن ماں نے بہت تسلی دی اور پڑوس کے ایک شخص کے ہاں لے کر چلی گئی۔ تین روز کے بعد ہم نے سنا کہ وہ گھوسی بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اس کا تمام مال و اسباب نیلام ہو گیا۔ بچاری گھوسن بھاگتے وقت کچھ نقدی اپنے ساتھ لے گئی تھی' جس سے وہ دو سال تک اپنا گذارہ کرتی رہی اور میری دلداری میں اس نے کسی قسم کی کمی نہیں کی۔

ایک روز رات کو ہمارے گھر میں چور آئے اور انہوں نے میری گھوسن ماں کے گلے میں سے ہنسلی اتارنی چاہی۔ گھوسن ماں کی آنکھ کھل گئی اور اس پر چوروں نے گھوسن ماں کا گلا گھونٹ ڈالا۔ وہ بچاری اس صدمے سے مرگئی۔

گھوسن ماں کے مرنے کے بعد ایک دو دن تک مکان والوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا بلکہ تسلی و تشفی سے پیش آتے رہے' مگر تین دن کے بعد اس مکان والے کی بیوی نے کہا "اری تو دن بھر بیٹھی رہتی ہے۔ کچھ کام کیوں نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں مفت کی روٹی نہیں ہے۔ خدمت کرے گی تو کھانے کو ملے گا۔" میں نے کہا "مجھے کام بتاؤ۔ تم جو کہو گی میں وہی کروں گی۔" اس عورت نے کہا "گھر میں جھاڑو دیا کر۔ بھینسوں کا گوبر اٹھایا کر اور ان کے اُپلے تھاپا کر۔"

میں نے جواب دیا۔ "اُپلے تھاپنے مجھ کو نہیں آتے۔ جھاڑو میں نے کبھی نہیں دی۔ یہ کام میں نے کبھی نہیں کیے۔ میں ہندوستان کے بادشاہ کی پوتی ہوں' مگر خدا نے یہ وقت مجھ پر ڈالا ہے' تو جو کام تم کہو گی وہی کروں گی۔ دو چار دفعہ مجھ کو یہ کام کر کے بتاؤ تا کہ میں سیکھ جاؤں۔" وہ عورت بڑی نرم مزاج تھی۔ اس نے مجھ کو جھاڑو دینی اور اُپلے تھاپنے سکھا دیئے اور میں یہ کام کرنے لگی۔

ایک دن مجھ کو شدت کا بخار تھا اور اس کی تکلیف کے سبب مجھ سے اُپلے نہ تھاپے گئے۔ اس عورت کا خاوند گھر میں آیا اور مجھ کو پڑا ہوا دیکھا تو اس نے میرے ایک ٹھوکر ماری اور کہا "دس بج گئے تو اب تک پڑی سوتی ہے۔ یہ لال قلعہ نہیں ہے۔ گھوسی کا گھر ہے۔ اٹھ کر بیٹھ اور گوبر تھاپ۔" گھوسی کے ٹھوکر مارنے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے' میں اٹھ بیٹھی اور کہا "مجھ سے خطا ہو گئی۔ میں ابھی گوبر تھاپتی ہوں۔" چنانچہ میں نے اسی بخار کی حالت میں جھاڑو دی اور اُپلے بھی تھاپے۔ اس وقت تو مجھے اتنی سمجھ نہ تھی' مگر آج جب مجھے اس مصیبت کا دھیان آتا ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ ان کم بخت ظالم باغیوں کی بدولت ہم لوگوں کو کیسی چتا سہنی پڑی۔ ہم اس محل کے رہنے والے تھے جس کے اندر کا تصور شاعروں سے عجیب و غریب نظمیں لکھواتا تھا اور جہاں یہ شعر لکھا ہوا تھا:

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمی است و ہمی است

(اگر زمین پر کہیں بہشت ہے تو وہ یہی ہے یہی ہے)

مگر مصیبت نے یہ دن دکھایا کہ ہم محلوں سے نکل کر در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے اور اُپلے تھاپتے تھے۔ دو سال اسی مصیبت میں گذرے۔ آخر اسی گھوسی نے اپنے بھائی کے ساتھ میری شادی کر دی' جہاں میری ساری عمر بسر ہوئی۔

میں نے گھوسیوں کی زندگی میں جان بوجھ کر کبھی قلعہ اور اس کی بادشاہی کا خیال نہیں کیا' مگر میں مجبور تھی کہ دل ہر روز بچپن کا وقت یاد دلاتا تھا اور سوتے میں بھی دیکھا کرتی تھی کہ میرے والد مرزا مغل مسند پر بیٹھے ہیں۔ میں ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ لونڈیاں چنور ہلا رہی ہیں اور دنیا مجھ کو بہشت کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے' لیکن جب آنکھ کھلتی تھی تو ٹوٹے ہوئے چھپر' ایک چکی' ایک چرخہ اور تین چار پائیوں کے سوا گھر میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیا تم مرزا مغل کی بیٹی لالہ رخ ہو؟ تو میں صاف کہہ دوں گی کہ نہیں۔ میں تو ایک غریب گھوسن ہوں' کیونکہ آدمی کی ذات وہی ہے کہ جس ذات کے کام کرتا ہو۔

☆ ☆ ☆

غدر کی زچہ

نواب فولاد خاں کی لاش پہاڑی کے مورچے سے گھر میں آئی تو ان کی بہو کے درد زہ ہو رہا تھا۔ اس وقت دلی کا کوئی گھر ایسا نہ تھا' جہاں بھاگنے اور شہر سے نکلنے کی تیاری نہ ہو رہی ہو۔ بہادر شاہ بادشاہ کی نسبت عام چرچا ہو گیا تھا کہ وہ بھی لال قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں چلے گئے۔

نواب فولاد خاں خاندانی امیر تھے' مگر ان کے والد کسی قصور کے سبب معین الدین اکبر شاہ کے دربار میں معتوب ہوئے اور منصب و جاگیر ہاتھ سے دے بیٹھے۔ اس وقت فولاد خاں جوان تھے اور انہوں نے انگریزی فوج میں نوکری کر لی تھی۔ فوج باغی ہوئی تو یہ بھی انگریزی سرکار سے برگشتہ ہو گئے۔ آخری دن وہ اپنے رسالے کو لے کر دھاوے پر گئے تھے۔ پہاڑی پر انگریزی مورچہ تھا۔ بڑی بہادری اور جی داری سے لڑے اور آخر ایک گولے کا ٹکڑا لگنے سے ان کا کام تمام ہو گیا۔ سپاہی لاش کو گھر میں لائے تو یہ تماشا دیکھا کہ ان کی بہو کے درد زہ ہو رہا ہے اور دائی کوئی ملتی نہیں۔

فولاد خاں کا جوان بیٹا چار دن پہلے مارا گیا تھا۔ غریب عورت چار دن کی بیوہ تھی۔ ساس کو مرے ہوئے دو برس گذر چکے تھے۔ گھر میں سسر کے سوا اور کوئی ولی وارث نہ تھا۔ اب وہ بھی خون میں نہائے' آنکھیں بند کئے' چہرے پر مردنی کی نقاب ڈالے گھر میں آئے تو سکینہ خانم کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔

گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ ایک چھوڑ چار چار ماما ئیں خدمت میں حاضر' لیکن سر دھرے کی ڈھارس ہی اور ہوتی ہے۔ سکینہ خانم نے سسرے کا مرنا سنا تو ہائے کا نعرہ مار کر بیہوش ہو گئی۔

لاش صحن میں رکھی تھی' سپاہی دروازے پر کھڑے تھے۔ سکینہ دالان میں پلنگ پر بیہوش پڑی تھی۔ دو ماما ئیں سکینہ کے سرہانے اور پائتی دم بخود بیٹھی تھیں اور دو اوسان باختہ کھڑی قدرت کی یہ سیر دیکھتی تھیں اور زار و قطار روتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد سکینہ خانم کو ہوش آیا اور درد کی شدت سے بیتاب ہو کر اس نے ماما سے کہا "دیکھو ڈیوڑھی پر کوئی سپاہی ہو تو اس سے دائی تلاش کراؤ۔" ماما دوڑی ہوئی دروازے پر گئی اور ہے ہے ہے ہے کہتی ہوئی الٹے پاؤں بھاگی ہوئی آئی اور کہا "بی بی! سپاہیوں کو گورے خاکی پکڑے لیے جاتے ہیں اور وہ گورے خاکی وردی والے (غدر میں انگریزی سپاہیوں کا نام خاکی تھا) ہمارے گھر کے قریب آتے ہیں۔ سکینہ بولی "مردار دروازہ تو بند کر۔" ماما پھر الٹی پھری اور اس نے دروازے کے کواڑ بند کر دیئے۔ اب درد اور بڑھا اور بیچاری سکینہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ نہ دائی پاس تھی نہ اور کچھ سامان۔ قدرت نے خود ہی مشکل آسان کر دی' مگر سکینہ غریب صدمے سے پھر بے ہوش ہو گئی' ماما نے جلدی سے لڑکے کو نہلایا اور نہالچے میں لپیٹ کر گود میں لے لیا۔

سکینہ کی عمر سترہ سال کی تھی۔ شادی کو صرف سوا برس ہوا تھا۔ میکہ فرخ آباد میں اور وہ دہلی میں۔ جہاں یہ افراتفری۔ ہوش آیا تو اس نے ماما سے کہا "مجھے سہارا دو۔ اٹھا کر بٹھاؤ۔" وہ بولی "بیٹی! ایسا غضب نہ کرنا۔ ابھی لیٹی رہو۔ تم میں بیٹھنے کی حالت کہاں ہے۔" سکینہ نے کہا "توبہ بوا۔ یہ وقت کہیں ان احتیاطوں کا ہے۔ قسمت خبر نہیں ابھی اور کیا کیا دکھائے گی۔"

ماما نے یہ سن کر سر کو سہارا دیا اور سکینہ کو بٹھا کر گاؤ تکیہ کمر سے لگا دیا۔ سکینہ نے پہلے اپنے بچے کو ماتا بھری نظروں سے دیکھا جو دنیا میں اس کی سب سے پہلی مراد تھی اور چاہا کہ برابر دیکھے جائے مگر اس کو شرم آ گئی اور اس نے مسکرا کر اپنا رخ بچے کی طرف سے ہٹا لیا۔ جوں ہی اس کی نظر صحن کی طرف گئی' فولاد خاں کی میت رکھی دکھائی دی۔ اس کی خوشی کو ایک دھکا سا لگا جس سے وہ بیتاب ہو گئی اور دانشمند ہونے کے باوجود اس کے منہ سے بہکی بہکی باتیں نکلنے لگیں۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"اپنے یتیم پوتے کو دیکھ لیجئے۔ اٹھیے جس کی آپ کو بہت آرزو تھی وہ پیدا ہو گیا۔ اس کے باپ کو گود میں لے کر قبر میں سلایا تھا۔ اس کو بھی آغوش میں لے کر قبر میں سو جائیے۔ میں بے وارثی اس کو کہاں رکھوں کیوں کر رکھوں۔ اس ننھے مہمان کو کیا خبر کہ جس گھر میں وہ آیا ہے' وہ ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ دہلی میں آپ میرے باپ تھے' آج آپ بھی مر گئے۔ فرخ آباد میں میرے باپ ہیں' مگر وہ جیتے جی مجھ سے بچھڑ گئے۔ اس لڑکے کا بھی ایک باپ تھا' جس سے میری دنیا آباد تھی۔ اس کو بھی گولی نے مار ڈالا۔"

یہ فقرہ کہہ کر سکینہ کو کچھ خیال آ گیا۔ اس نے دل کی چھپی ہوئی تکلیف سے بے تاب ہو کر آہستگی سے بایاں ہاتھ اس پر رکھ دیا اور دایاں ہاتھ منہ پر رکھ کر گردن تکیے سے لگا کر رونے لگی اور روتے روتے اس کو پھر غش آ گیا۔

ماما نے سکینہ کو غشی میں چھوڑا اور دروازہ کھول کر باہر گئی کہ کسی کو بلائے اور فولاد خاں کے دفن کا بندوبست کرے' مگر اس کو ساری گلی سنسان نظر آئی۔ ایک آدمی بھی چلا پھرتا دکھائی نہ دیا' تو اشارے سے دوسری ماما نے بلایا اور کہا "بوا! اپنی جان کی خیر مناؤ اور چلو یہاں سے بھاگ چلو۔ بیوی کے ساتھ رہیں تو جان مفت میں جاتی رہے گی۔" وہ بولی "ایسے کٹھن وقت میں مالک کو دغا دینا اور اپنی جان لے کر بھاگ جانا بڑی بے وفائی اور بے مروتی کی بات ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ ایک بے کس بچہ بھی ہے۔" پہلی نے جواب دیا "دیوانی بنی ہے۔ کس کی وفا' کیسی مروت۔ جان ہے تو جہان ہے۔ میں تو جاتی ہوں۔ تو جانے تیرا کام۔ خاکی ابھی آتے ہوں گے۔ گھر لوٹ لیں گے اور ہم سب کو مار ڈالیں گے۔" یہ سن کر

دوسری کے دل میں بھی سختی پیدا ہوئی اور اس نے تیسری اور چوتھی کو اشارے سے پاس بلایا۔ وہ نامرادیں بھی بھاگنے پر آمادہ ہو گئیں اور کہا ''چلتی ہو تو کچھ خرچ لے کر چلو۔ سکینہ بے ہوش ہے۔ کنجیاں سرہانے سے لے لو اور نقدی کا صندوقچہ کوٹھری سے نکال کر چل دو۔''

جس کی گود میں بچہ تھا' اس کو ترس آیا اور کہنے لگی ''اس کو کون رکھے گا۔'' ایک نے کہا ''ماں کے پاس لٹا دو۔'' بولی ''نہیں بوا! میں اس کو ساتھ لے کر چلوں گی۔'' سب ایک منہ ہو کر بولیں ''واہ سبحان اللہ! اپنی جان تو سنبھلتی نہیں' بچے کو کیونکر سنبھالو گی۔ اس کے علاوہ بیچاری سکینہ پھڑک کر مر جائے گی۔ تم کو رحم نہیں آتا۔'' اس نے جواب دیا ''تم سکینہ کو اکیلا چھوڑ کر جاتی ہو۔ اس پر تم کو رحم آتا نہیں۔ میں اس لال کو کیوں نہ لے جاؤں۔ میں اپنی بیٹی کو دوں گی۔ وہ اس کو پالے گی۔ اس کا بچہ ابھی مر گیا ہے۔ یہاں چھوڑا تو سکینہ بھی مرے گی اور یہ بچہ بھی۔''

آخر وہ چاروں کی چاروں نقدی کا صندوقچہ اور بچے کو ساتھ لے کر گھر سے نکل کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلی گئیں اور سکینہ کو اس گھر میں اکیلا چھوڑ دیا' جہاں ایک لاش کے سوا دوسرا آدمی نہ تھا۔

سکینہ پر زچگی کی ناتوانی' بے کسی و پریشانی کا ایسا اثر ہوا تھا کہ چار گھنٹے بیہوش رہی۔ رات کے آٹھ بجے ہوش آیا تو گھر میں اندھیرا گھپ تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ جب کچھ دکھائی نہ دیا تو سمجھی میں مر گئی ہوں اور یہ قبر کی تاریکی ہے۔ بے اختیار منہ سے کلمہ نکلا اور اس نے کہنا شروع کیا ''دین میرا اسلام' رسول میرا محمدؐ۔ خدا میرا ایک وحدہ لاشریک۔ یا اللہ توبہ ہے میں بے گناہ ہوں۔ میری قبر کو اندھیرے میں نہ رکھ اور جنت کی روشنی دے۔''

تھوڑی دیر میں اس کو آسمان پر تارے چمکتے دکھائی دیئے اور وہ سمجھی کہ میں زندہ ہوں اور پلنگ پر لیٹی ہوں۔ تب تو اس نے ماماؤں کو آوازیں دینی شروع کیں۔ جب کوئی نہ بولا تو ڈر کر اور بے اوسان ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی کمزوری جاتی رہی یا اس کو یاد نہ رہا کہ میں کمزور ہوں۔ پلنگ سے نیچے اتری۔ شمع روشن کی تو اس نے دیکھا گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے۔ صحن میں سسرے کی لاش رکھی ہے۔ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

رات کے وقت مردے کو دیکھ کر اس کو بہت ڈر لگا اور چیخیں مارنے لگی۔ محلے میں کوئی آدمی ہوتا تو چیخنے کی آواز سے دوڑ کر اندر آتا' مگر محلے والے تو پہلے ہی سب بھاگ چکے تھے۔ سکینہ چیختے چیختے ایسی دہلی اور ایسی ڈری کہ اس کے حواس جاتے رہے اور تڑاخ کھا کر فرش پر گر پڑی اور پھر اس کو غش آ گیا۔

صبح تک اس کے حواس درست نہ ہوئے اور وہ فرش پر بے ہوش پڑی رہی۔ دن چڑھا تو اس نے آنکھ کھولی۔

اس وقت دل میں ایک طرح کی سہار اس کو معلوم ہوئی۔ اگرچہ دو وقت سے اس نے کچھ کھایا نہ تھا' مگر غم اور خوف' مصیبت کی تیزی میں انسان کو مضبوط بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ فوجی گھرانے میں پرورش پانے کے سبب اس کا دل بھی عام عورتوں کی طرح بودا نہ تھا۔ اس نے چاہا کہ میت کو دفن کرنے کی تدبیر کرے اور خود کچھ کھائے' کیونکہ بھوک اس کو شدت کی معلوم ہوتی تھی۔ یکا یک اس کو خیال آیا کہ میرا بچہ کیا ہوا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ کلیجے میں ماتا کی ایک ہوک سی اٹھی اور اس نے دیوانوں کی طرح دوڑ دوڑ کر سارے گھر میں ڈھونڈنا شروع کیا اور جب کہیں بچہ نہ ملا تو پانی کے مٹکوں کی چپنیاں اٹھا اٹھا کر مٹکوں کو جھانکنے لگی کہ ان کے اندر میرا بچہ نہ ہو۔ پلنگ کے تکیے اٹھا اٹھا کر چھاتی سے لگانے لگی۔

آخر مصیبت کے عروج نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کے دل کو تھوڑی سی تسلی دی اور وہ بچے کے خیال کو بھول گئی اور سسرے کے دفن کا خیال اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے الماری کھولی' ایک سفید چادر نکالی اور شہید کی لاش پر ڈال دی اور مصلیٰ بچھا کر سجدے میں گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی:

"اے خدا! تیرے ایک بندے کی لاش ہے' جس کو نہ کفن میسر ہے نہ دفن' قبر نصیب ہے نہ نماز' اپنے فرشتوں کو بھیج کہ وہ اس کی نماز پڑھیں اور اپنی آغوش رحمت میں اس کو دفن کر دیں۔ مجھے سب نے دعا دی۔ میرا تاجدار بھی ملک خاک کے پردیس میں چلا گیا۔ میرا لال بھی مجھ سے چھن گیا۔ اب تیرے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ یہ بیکسی کا سجدہ قبول کر اور میرا ہاتھ پکڑ۔"

سکینہ خانم ابھی سجدے میں تھی کہ دروازہ کھلا اور چار سپاہی خاکی وردی پہنے ہوئے اندر آئے۔ سکینہ نے جلدی سے سر اٹھایا اور نامحرم مردوں کو آتا دیکھ کر چادر چہرے پر ڈال لی اور ڈر کر کونے میں چھپنا چاہا' مگر سپاہی اندر آ چکے تھے۔ انہوں نے سکینہ کو پکڑ لیا اور زبردستی چہرہ کھول کر دیکھا اور سب مل کر بولے "جوان ہے جوان ہے اور بڑی خوبصورت۔"

اس کے بعد انہوں نے سکینہ کو چھوڑ دیا اور گھر کا سب اسباب دیکھنے لگے۔ نقدی تو مامائیں لے گئی تھیں۔ کچھ زیور اور نفیس کپڑے انہوں نے لوٹے۔ صحن میں میت کے اوپر سے چادر اٹھا کر انہوں نے کہا "اوفو یہ کوئی بڑا باغی ہے۔"

اس کے بعد سپاہیوں نے سکینہ کو ہاتھ پکڑ کے اٹھا لیا اور کہا "چل ہمارے ساتھ چل۔" سکینہ منہ سے نہ بولی اور سپاہیوں کے جبر سے مجبور ہو کر کھڑی ہو گئی۔ وہ نہ کہہ سکی کہ میں زچہ ہوں۔ اس نے نہ کہا کہ میں بھوکی ہوں۔ اس کے منہ سے نہ نکلا کہ مجھے نہ ستاؤ۔ میرا اس دنیا میں کوئی حامی نہیں ہے۔ اس کو خاندانی شرافت اور غیرت بات کرنے سے روکتی تھی۔

جب سپاہی اس کو گھسیٹ کر لے چلے اور سکینہ دروازے پر پہنچ گئی تو اس نے مڑ کر گھر کو دیکھا اور ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا:

"رخصت اے سسرال' سلام اے بے گور و کفن مرنے والے۔ میں ان تلوار چلانے والوں کی ناموس ہوں' جو زندہ ہوتے تو اپنی آبرو پر مر جاتے۔"

سکینہ کے اس درد بھرے فقرے پر سپاہی ہنسے اور اس کو کھینچتے ہوئے باہر چلے گئے۔ سکینہ کچھ دور تو چپ چاپ چلی گئی۔ اس کے بعد اس نے کہا:

"میں زچہ ہوں' مجھ پر رحم کرو۔ میں بھوکی ہوں' مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں تمہارے ملک کی ہوں' میں تمہارے مذہب کی ہوں' میں عورت ہوں اور بے خطا ہوں۔"

یہ سن کر چاروں سپاہی رک گئے اور انہوں نے افسوس کر کے کہا "تو نہ گھبرا۔ ہم تیرے لیے سواری لاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر تین آدمی ٹھہر گئے اور ایک آدمی زخمیوں کی گاڑی لایا' جس میں سکینہ کو ڈال کر پہاڑی کے کیمپ میں لے گئے۔

بارہ برس کے بعد

کسی کو معلوم نہیں، غدر کی زچہ سکینہ پر بارہ برس کیسے گذرے اور وہ کہاں کہاں رہی اور اس نے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں۔ ہم نے جب اس کو دیکھا تو رہتک کے ایک محلے میں وہ بھیک مانگ رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں جوتی نہ تھی۔ اس کا پاجامہ پھٹا ہوا تھا' اس کا کرتا بے حد میلا اور پیوندار تھا اور سر کا دوپٹہ بالکل پھٹا ہوا ایک چیتھڑا سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ غالباً بہت فاقہ زدہ تھی۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ سر کے بال الجھے ہوئے تھے' چہرے پر حسن موجود تھا' مگر لٹا ہوا۔ آنکھوں میں قدرتی زیبائش موجود تھی' لیکن اجڑی ہوئی اور ستائی ہوئی۔ وہ چلنے میں چکراتی تھی اور دیوار پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیتی تھی۔ اس کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے تو ذرا ٹھہر کر سانس لیتی تھی' پھر آگے بڑھتی تھی۔

تھوڑی دور جا کر اس کو ایک شادی کا گھر ملا' جہاں سینکڑوں آدمی کھانا کھا کر باہر آ رہے تھے۔ یہ وہاں ٹھہر گئی اور اس نے بڑے دردناک انداز سے یہ صدا لگائی:

''فلک کی ستائی ہوں۔ بڑے گھر کی جائی ہوں' عزت گنوا کر شرم مٹا کر روٹی کھانے آئی ہوں۔ بھلا ہو صاحب' روٹی کا ٹکڑا مجھ کو بھی۔ سہرے کی خیر' گھوڑے کی خیر' جوڑے کی خیر' ایک نوالہ مجھ کو بھی۔''

سکینہ کی صدا فقیروں کے غل شور میں کسی نے نہ سنی بلکہ ایک نوکر نے جو شادی کا منتظم تھا' اس کو ایسا دھکا دیا کہ بیچاری چاروں شانے چت گر پڑی اور گرتے وقت بے کسی کے لہجے میں اس نے کہا:

''میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا' مجھے نہ مار کہ میں خود قسمت کی ماری ہوئی ہوں۔ اے خدا میں کہاں جاؤں' اپنی بپتا کس کو سناؤں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

ایک لڑکا کھڑا ہوا یہ حال دیکھ رہا تھا۔ اس کو خود بخود سکینہ پر ترس آیا اور بے اختیار رونے لگا۔ اس نے سکینہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور کہا'' آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو روٹی دوں۔''

سکینہ لڑکے کے ساتھ بمشکل اٹھ کر گئی۔ لڑکا قریب کے ایک گھر میں خدمت گاری پر نوکر تھا۔ وہاں لے گیا اور شادی کا آیا ہوا اپنے حصے کا کھانا اس کے آگے رکھا۔ سکینہ نے دو لقمے کھائے۔ پانی پیا۔ آنکھوں میں دم آیا تو لڑکے کو ہزار ہزار دعائیں دینے لگی۔

اب جو اس نے لڑکے کو غور سے دیکھا تو اس کے دل میں دھواں سا اٹھا اور وہ بے اختیار ہو کر لڑکے کے گلے لگ کر رونے لگی اور لڑکا بھی سکینہ کو چمٹ کر بے تاب سا ہو گیا۔ سکینہ نے پوچھا'' تو کس کا بچہ ہے؟'' بولا'' میری ماں اس گھر کی ماما ہے اور میں یہیں نوکر ہوں۔'' سکینہ نے کہا'' تمہاری ماں کہاں ہے؟'' لڑکے نے جواب دیا'' وہ اور نانی دونوں شادی میں گئی ہوئی ہیں۔ ان چودھرائن کے ساتھ جن کی وہ نوکر ہیں۔'' سکینہ یہ سن کر چپ ہو گئی۔ مگر وہ سوچتی تھی کہ اس لڑکے پر مجھے ایسی محبت کیوں آ رہی ہے۔ بیشک اس نے مجھ پر احسان کیا ہے' لیکن احسان دل کو بے قرار نہیں کیا کرتا۔

اتنے میں لڑکے کی ماں اور نانی گھر میں آئیں تو سکینہ نے فوراً پہچان لیا کہ لڑکے کی نانی سکینہ کی ماما ہے جو غدر میں اس کے بچے کو لے کر بھاگ گئی تھی۔ ماما نے سکینہ کو نہ پہچانا' مگر جب سکینہ نے اس کا نام لے کر پکارا اور اپنا نام اور حال

اس کو بتایا تو ماما اس کو لپٹ گئی اور بے اختیار رونے لگی۔

لڑکے کو معلوم ہوا کہ میں دراصل سکینہ کا بیٹا ہوں' تو وہ پھر دوبارہ سکینہ کو چمٹ کر رونے لگا اور سکینہ نے اپنے بچے کو چھاتی سے لگا کر آسمان کو دیکھا اور کہا:

''شکر اے پروردگار! احسان اے مولا! کہ غدر کی تباہی میں میرے بچے کو زندہ رکھا اور بارہ برس کے بعد مجھ کبڑی کے دن پھیر دیئے۔''

اس کے بعد سکینہ نے فرخ آباد اپنے میکے میں خط بھجوایا۔ وہاں باپ مر چکے تھے۔ تین بھائی زندہ تھے۔ وہ رہتک آئے اور بہن اور بھانجے کو ہمراہ لے گئے۔ لڑکے نے ماما اور اس کی لڑکی یعنی پالنے والی کو ساتھ لے لیا اور فرخ آباد جا کر انہوں نے امیرانہ زندگی بسر کی۔

☆ ☆ ☆

بھکاری شہزادہ

دہلی کی جامع مسجد سے جو راستہ ٹیا محل اور چتلی قبر ہوتا ہوا دہلی دروازہ کی طرف گیا ہے' وہاں ایک محلہ کلو خواص کی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ اس محلے سے روزانہ رات کو اندھیرا ہو جانے کے بعد ایک فقیر باہر آتا ہے اور جامع مسجد تک جاتا ہے۔ پھر وہاں سے واپس چلا آتا ہے۔ اس فقیر کا قد بہت لمبا ہے۔ جسم دبلا ہے۔ داڑھی چگی ہے اور سفید ہے۔ گلے پچکے ہوئے ہیں۔ آنکھوں سے معذور ہے۔ میلا پیوند لگا ہوا ایک پاجامہ ہے۔ ٹوٹی ہوئی جوتیاں جن کو لیترا کہنا چاہئے' پیروں میں ہیں۔ کرتہ بہت میلا ہے اور اس میں بھی دس بارہ پیوند ہیں۔ سر پر پٹھے ہیں' لیکن بال بہت الجھے ہوئے ہیں۔ پھٹی ہوئی ایک ٹوپی تالو پر رکھی ہے۔ فقیر کے ایک ہاتھ میں بانس کی اونچی سی لکڑی ہے اور ایک ہاتھ میں مٹی کا پیالہ ہے جس کا ایک کنارہ ٹوٹا ہوا ہے۔ فقیر کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو چنڈو پیتا ہے اور یا کئی مہینے کی بیماری کے بعد آج ہی اٹھا ہے کیونکہ چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ جب چلتا ہے تو داہنے پاؤں کو گھسیٹ کر قدم اٹھاتا ہے۔ شاید اسے کبھی فالج ہو گیا ہو۔

دردناک آواز

اس کی آواز بہت بلند اور دردناک ہے۔ جب وہ نہایت مایوس اور حسرت آمیز لہجے میں بلند آواز سے کہتا ہے ''یا اللہ ایک پیسے کا آٹا دلوا دے۔ ٹو ہی دے گا۔ ٹو ہی دلوائے گا۔ ایک پیسے کا آٹا دلوا دے۔'' تو بازار والے اور بازار کے قریب جتنے گھر ہیں' ان کے رہنے والے اس آواز سے خود بخود متاثر ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے سوائے دو چار کے کوئی بھی واقف نہیں ہے کہ فقیر کون ہے اور اس کی آواز میں اتنا درد کیوں ہے۔ بعض گھروں کی عورتیں تو یہ کہنے لگتی ہیں کہ شام ہوئی اور یہ منحوس آواز کانوں میں آئی۔ ہمارا تو کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے' جب یہ آواز سنتے ہیں۔ خبر نہیں کون فقیر ہے

جو ہمیشہ رات ہی کے وقت بھیک مانگنے نکلتا ہے۔ دن کو بھی اس کی آواز نہیں آتی۔

فقیر جب کلوخواص کی حویلی سے بازار میں آتا ہے تو سیدھا جامع مسجد کی طرف لکڑی ٹیکتا ہوا اپنے داہنے مفلوج پاؤں کو کھینچتا ہوا ٹوٹے ہوئے لیتڑوں سے خاک اڑاتا ہوا آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ ایک ایک منٹ کے وقفے کے بعد اس کی زبان سے بس یہ صدا بلند ہوتی ہے "یا اللہ! ایک پیسے کا آٹا دلوادے۔ تو ہے دے گا۔ تو ہی دلوائے گا۔ ایک پیسے کا آٹا دلوا دے۔"

فقیر کسی دکان پر یا کسی شخص کے سامنے ٹھہرتا نہیں۔ سیدھا چلتا رہتا ہے۔ اگر کسی راہ گیر کو یا دکان دار کو رحم آ گیا اور اس نے فقیر کے پیالے میں پیسہ ڈال دیا یا آٹا یا اور کچھ کھانے کی چیز ڈال دی تو فقیر نے بس اتنا کہا "بھلا ہو بابا۔ خدا تم کو برا وقت نہ دکھائے۔" اور آگے بڑھ گیا۔ آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے دیکھ بھی نہیں سکتا کہ اس کو خیرات دینے والا کون تھا اور کون ہے۔

جامع مسجد سے واپسی کے وقت بھی یہی آواز لگاتا ہوا کلو خاص کی حویلی میں آ جاتا ہے۔ اس حویلی میں غریب مسلمانوں کے بہت سے الگ الگ چھوٹے چھوٹے مکان ہیں۔ انہی مکانوں میں ایک بہت ہی چھوٹا اور ٹوٹا پھوٹا مکان اس فقیر کا بھی ہے۔ گھر کے دروازے پر واپس آتا ہے تو کواڑوں کی لگی ہوئی کنڈی کھول کر اندر جاتا ہے۔ اس مکان میں صرف ایک دالان ہے اور ایک کوٹھڑی ہے اور ایک پاخانہ ہے اور چھوٹا سا صحن ہے۔ دالان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی ہے اور فرش پر ایک پھٹا ہوا کمبل بچھا ہوا ہے۔

بادشاہ کا نواسہ

دہلی والوں کو معلوم ہی نہیں کہ یہ فقیر کون ہے۔ بس دو چار جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ بہادر شاہ بادشاہ کا حقیقی نواسہ ہے اور اس کا نام میرزا قمر سلطان ہے۔ غدر سے پہلے خوبصورت جوان تھا اور قلعہ میں اس کے حسن کی اور قد رعنا کی بڑی دھوم تھی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتا تھا تو قلعہ کی عورتیں اور دہلی کے بازار والے راستہ چلتے چلتے کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کی خوبصورتی کو دیکھتے تھے اور سب لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔

یا آج یہ وقت ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے اور مسلمانوں کی سلطنت اور تہذیب کی بربادی نے اس کو بھکاری بنا دیا۔ گورنمنٹ نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کی تھی۔ وہ بھی فضول خرچی کی وجہ سے بنیے کے ہاں رہن ہو گئی۔ اب رات کو گداگری کے لیے نکلتا ہے اور جو کچھ مل جاتا ہے اس سے دونوں وقت کی گذر اوقات کر لیتا ہے۔

کسی نے پوچھا "میرزا! تم دن کو باہر کیوں نہیں آتے؟" شہزادہ قمر سلطان نے جواب دیا "جن بازاروں میں میری اچھی صورت اور شاندار سواری کی دھوم مچا کرتی تھی ان بازاروں میں یہ بری حالت لے کر دن کے وقت نکلتے ہوئی شرم آتی ہے اس لیے رات کو نکلتا ہوں اور صرف خدا سے مانگتا ہوں اور اسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں اور مجھے وہی دیتا ہے۔"

پھر کسی نے کہا "میرزا! کیا افیون کی عادت بھی ہے؟" تو شہزادہ قمر سلطان جواب دیتا ہے کہ جی ہاں بری صحبت

کے سبب افیون کی عادت بھی پڑ گئی ہے اور کبھی کبھی چنڈو بھی پی لیتا ہوں۔"

پھر پوچھا گیا کہ "غدر سے لے کر آج تک تم پر کیا گذری ذرا اس کا حال بھی تو سناؤ" تو قمر سلطان ایک ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو جاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد کہتا ہے "کچھ نہ پوچھو۔ خواب دیکھ رہا تھا آنکھ کھل گئی۔ اب جاگ رہا ہوں اور وہ خواب پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ نہ اس کے نظر آنے کی امید ہے۔"

☆ ☆ ☆

جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا

جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا اور دلّی کی محفل میں شمع بھی روشن تھی اور گل اندام بھی زندہ تھے۔ ایک میخوار نے جھوم جھوم کر کہا تھا۔

"یارو! یہ آخری رات ہے۔ غنیمت جانو جو یہ چند ہم صورت اور ہم خیال جمع ہیں۔ کل یہاں کچھ نہ ہوگا۔"

(۱)

اس وقت شہزادہ گل اندام نے انگڑائی لے کر جواب دیا تھا "کل کی فکر میں آج کی بزم کو کیوں مکدر کرتے ہو۔ مانا کہ بہادر شاہ قلعہ چھوڑ کر چلے گئے اور صبح انگریز پہاڑی کے مورچے سے شہر کے اندر آ جائیں گے مگر جو وقت میسر ہے اس کو غنیمت جانو اور دو گھڑی غم ایام کو دل سے دور رکھو۔ لاؤ میاں ساقی! ایک جام اور دے دو۔ پی لیں اور اس آخری شمع کو ایک دفعہ جی بھر کر اور دیکھ لیں۔"

صبح قریب تھی۔ پہاڑی کا مورچہ دلّی پر رات بھر گولے برساتا رہا اور اب بھی توپوں کی گرج سے دلّی کے در و دیوار لرز رہے تھے۔

(۲)

خاص بازار کے ایک عالیشان مکان میں چند نوجوان جمع تھے۔ ستار بج رہا تھا۔ دور چل رہا تھا۔ چنگیروں میں پھول بھرے رکھے تھے۔ چاروں طرف شمع دان تھے اور ان میں پگھلی ہوئی شمعیں جھلملا رہی تھیں۔

شہزادہ گل اندام بہادر شاہ کے قریبی رشتے دار تھے۔ گل رو نواب جھجر کی برادری کا ایک نوعمر لڑکا اس محفل رندانہ کا روح رواں تھا۔ دلّی میں ہر شخص کو یقین تھا کہ کل دہلی مغلوب ہو جائے گی۔ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے ہیں۔ انگریز سویرے آ جائیں گے اس لئے آج انہوں نے ایک آخری بہار اپنی سلطنت اور اس کے عیش و نشاط کے دیکھنے کو یہ مجلس آراستہ کی تھی۔ قمر تمری نام کا ایک خوش گلو اور خوش رُو زنانہ ساقی بنایا گیا تھا۔ دردناک اشعار پڑھے جا رہے تھے اور موت ہر شخص کے سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔

صبح کی اذان ہوئی۔ سب کھڑے ہو گئے۔ گل اندام کے ملازم نے خبر دی' دروازے پر رتھ حاضر ہے۔ گل اندام نے ساقی کو انعام دیا۔ گل رو کو گلے لگا کر رخصت کیا اور رتھ میں سوار ہو کر الور کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۳)

پندرہ دن کے بعد الور میں مشہور ہوا کہ دلی سے انگریز مخبر آئے ہیں اور ان لوگوں کی تلاش ہو رہی ہے جو بادشاہ کے قرابت دار ہیں یا غدر میں حصہ لے چکے ہیں۔

گل اندام باریک ململ کا کرتہ پہنے' پنکھا ہاتھ میں لیے مکان کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ چند آدمی بے باکانہ کوٹھے پر آ گئے اور کہا "صاحب عالم! آپ گرفتار ہیں۔ چلیے نیچے سواری حاضر ہے۔"

گل اندام مسکراتا ہوا نیچے آیا اور رتھ میں سوار ہو کر دلی کی طرف روانہ ہوا۔ سات آٹھ رتھوں میں قیدی سوار تھے' مگر ان میں کوئی مغموم معلوم نہ ہوتا تھا۔ سب ہنستے بولتے جا رہے تھے۔

(۴)

چاندنی چوک سنہری مسجد کے سامنے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ انگریز عورت مرد بیٹھے تھے۔ سامنے پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ قیدی مشکیں بندھے کھڑے تھے۔ ایک ایک کو لاتے اور پھانسی پر لٹکاتے تھے۔

گل اندام کو بھی لائے۔ اس کا وہی ٹھاٹھ تھا۔ شبنمی ململ کا کرتہ' ٹاٹ بانی جوتی' گوری رنگت کا چوڑا سینہ' سرمئی بڑی بڑی آنکھیں' پتلی کمر' سرو قد' چہرے پر تبسم کا انداز۔ حاکم نے کہا "شہزادہ گل اندام! تم پر بغاوت میں حصہ لینے کا الزام ہے۔ اس لیے تم کو پھانسی دی جاتی ہے۔"

گل اندام نے گردن موڑ کر حاکم کو دیکھا اور کہا:

"مجھے حکومت کی بغاوت و اطاعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ خدا کا گناہ ضرور کرتا تھا۔ پیتا تھا' پلاتا تھا اور ہر وقت غم ایام سے دور رہنا چاہتا تھا۔ تم کہتے ہو میں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ ہاں سچ ہے میں نے خدا سے بغاوت کی تھی اور میں ہر سزا کا مستحق ہوں۔"

حاکم نے یہ تقریر سنی اور سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ گل اندام کو پھانسی کے تختے پر لے گیا اور رسی گلے میں ڈال دی۔ یکایک ایک چیخ کی آواز آئی۔ سب لوگ ہجوم کی طرف دیکھنے لگے جو قریب ہی ایک طرف کھڑا تھا۔ دیکھا ایک بوڑھی عورت زار و قطار رو رہی ہے اور دونوں ہاتھ مل رہی ہے۔ اور "میرا بیٹا" "میرا گل اندام" کہہ کہہ کر بے قرار ہو رہی ہے۔

گل اندام نے بھی اپنی بے کس بوڑھی ماں کو نگاہ پھیر کر دیکھا کہ تختہ کھینچ گیا اور گل اندام پھانسی میں لٹک گیا۔

حاکم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور سپاہی بھی گل اندام کی ماں کی بے تابی کو دیکھ کر رونے لگے۔

(۵)

۱۹۳۰ء میں دلّی کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی' مگر دلی والے نہ تھے۔ سب باہر کے لوگ یہاں آباد تھے۔ گل اندام کی لاش لال قلعہ کی کھائی میں سلیم گڑھ کے قریب دفن کی گئی تھی۔ وہاں ایک بوڑھے آدمی دہلی کا رسالہ ''ساقی'' لیے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ یکا یک ان کو خیال آ گیا کہ میں بھی گل اندام کی آخری محفل میں شریک تھا۔ اگر چہ بچہ تھا اور خدمتگاری کر رہا تھا' مگر وہ سب سماں آنکھوں کے سامنے ہے اور جس دن گل اندام کو پھانسی دی گئی اور اس کی لاش یہاں کھائی میں ڈالی گئی اس دن بھی موجود تھا۔ لاؤ پکار کر دیکھوں شاید اس کھائی میں گل اندام کی کوئی ہڈی یا جسم کی خاک کا کوئی ذرہ باقی ہو اور وہ مجھ کو جواب دے اور یہ خیال آتے ہی ان کو غش آ گیا اور کئی گھنٹے بے ہوش پڑے رہے۔

☆ ☆ ☆

جب میں شہزادہ تھا

بمبئی کے بھنڈی بازار میں مغل ہوٹل کے برابر ایک بڈھا آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ آنے جانے والوں نے پہلے خیال کیا کہ کوئی تھکا ہوا مسافر بے جواب تک سوتا ہے۔ بھنڈی بازار کی ان پٹڑیوں پر جن پر پیدلوں کا راستہ ہے' صبح کے وقت سینکڑوں پردیسی مسافر جن کو مکان میسر نہیں' پڑے سویا کرتے ہیں' لیکن جب دس بج چکے اور بڈھا بیدار نہ ہوا تو پہرے والے سپاہی نے قریب آ کر دیکھا۔ بڈھا بہت کمزور اور ناتواں تھا۔ چگی داڑھی' بھوؤں تک کے بال سفید' چہرے پر جھریاں' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں' بدن پر ایک میلا کرتہ جس میں کئی پیوند' ٹانگوں میں گاڑھے کا پاجامہ۔

سپاہی نے پہلے تو جگانا چاہا اور جب وہ نہ جاگا تو قریب آ کر غور سے اس کی صورت دیکھی اور بولا ''یہ تو شاید مر گیا۔'' دو تین راہگیروں نے جھک کر بڈھے کو کروٹ دی۔ اس کا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا سانس آ رہا ہے' مگر کسی وجہ سے بے ہوش ہے۔

سپاہی نے ایک وکٹوریہ گاڑی والے کو آواز دی اور بڈھے کو اٹھا کر اس میں لادا اور جے جے ہسپتال میں لے گیا۔ پارسی ڈاکٹر نے بڈھے کو دیکھ کر کہا ''اس کو کسی نے کچھ کھلا دیا ہے۔ زہر اثر کر چکا۔ اب اس کا علاج مشکل ہے۔'' پھر بھی اس نے کوشش شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد بڈھے کو ہوش آیا اور اس نے کہا ''بیٹی! تو کہاں چلی گئی۔''

بڈھے کی آواز اس قدر ناتوان تھی کہ کمپوڈر کے سوا کسی نے نہ سنی اس لیے اس نے کہا ''ارے تو اب اسپتال میں ہے۔ تیری بیٹی یہاں نہیں ہے۔'' بڈھے نے پھر مری ہوئی دھیمی آواز میں کہا ''میں نے سات وقت سے کچھ نہیں کھایا۔ مجھے کچھ کھانے کو دو۔ میری بیٹی نے کئی دن سے خبر نہیں لی وہ مجھ کو روٹی کھلایا کرتی تھی۔ خبر نہیں وہ کہاں چلی گئی۔''

کمپوڈر نے ڈاکٹر سے یہ حال کہا۔ ڈاکٹر نے شوربا تجویز کیا جو تھوڑا تھوڑا کر کے اس کو پلایا گیا۔ جب بڈھے میں ذرا جان آئی تو پولیس والوں نے اس کے اظہار لیے' کیونکہ تھانے کا محرر اس کی بیہوشی میں ایک پھیرا کر کے چلا گیا تھا۔ جب اس کو خبر ہوئی کہ بڈھے کو ہوش آ گیا تو وہ پھر آیا اور اس کے حالات دریافت کیے۔

بڈھے نے کہا "میں چار مہینے سے بمبئی میں رہتا ہوں۔ میرا کوئی مکان نہیں ہے۔ سڑکوں پر گزارہ کر لیتا ہوں۔ میری ایک بیٹی پکانے کی نوکری کرتی ہے۔ وہ کھیت باڑی میں ایک طوائف کے ہاں نوکر تھی اور صبح شام مجھ کو اپنے حصے کے کھانے میں سے آدھا کھانا سڑک پر آ کر دے جاتی تھی' مگر چار دن سے وہ نہیں آئی۔ جس مکان پر وہ نوکر تھی' میں وہاں بھی گیا اور رنڈی سے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے کہا وہ تو دس دن ہوئے ہماری نوکری چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ یہ سن کر میں نے اس کو اور کئی جگہ ڈھونڈا' مگر وہ کہیں نہ ملی۔ جب یہ چھ وقت کا فاقہ ہو چکا اور مجھ میں چلنے کی طاقت نہ رہی تو میں بھنڈی بازار کی سڑک پر رات کو لیٹ رہا اور بیہوش ہو گیا۔"

تھانے کے محرر نے پوچھا "تم تو بھیک مانگتے تھے۔ پھر کیوں بھوکے رہے۔ بمبئی شہر میں بھیک مانگنے والے بی اے پاس لوگوں سے زیادہ کما لیتے ہیں۔"

بڈھے نے محرر کی یہ بات سنی تو اس کو اس قدر طیش آیا کہ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں اور اس نے اپنی کمزور آواز حلق سے بہت زور کے ساتھ باہر نکال کر کہا۔ "بس جناب چپکے رہیے۔ زیادہ بکواس نہ کیجیے۔ شاید آپ نے اپنے باوا کے ساتھ مجھ کو بھیک مانگتے دیکھا ہوگا۔"

محرر کو ایک شکستہ حال کنگلے کی یہ بات تیر ہو کر لگی اور اس نے بڈھے کے ایک طمانچہ مارا۔ بڈھا طمانچہ کھا کر چت گر پڑا' مگر فوراً اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کا رول میز پر سے اٹھا کر محرر کے سر پر مارا' جس سے محرر کا سر پھٹ گیا اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔ لوگوں نے بڈھے کو پکڑ لیا ورنہ وہ دوسرا وار کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر نے محرر کو ڈریسنگ روم میں لے جا کر اس کے زخم کو دھویا اور دوا لگائی۔ سپاہی بڈھے کو لے کر تھانے میں پہنچا۔ یورپین انسپکٹر وہاں موجود تھا۔ جب اس نے بڈھے کے حالات سنے تو اس کو بھی بہت غصہ آیا' مگر اس نے کہا محرر کے بیان تک اس کو حوالات میں رکھو۔

شوربا پی کر بڈھا بہت تیز ہو گیا تھا اور محرر کو برابر برا کہہ رہا تھا۔

زخم پر پٹی باندھے ہوئے محرر تھانے میں آیا اور انسپکٹر کو واقعات کی رپورٹ سنائی۔ اس نے بڈھے کو حوالات سے نکال کر پھر اس کے بیانات لکھنے شروع کیے۔

بڈھے نے کہا "میں بیان اس وقت دوں گا کہ پہلے آپ کے محرر صاحب مجھ سے معافی مانگیں۔ انہوں نے مجھ جیسے عزت دار کو بھک منگا کیوں کہا۔"

محرر نے کہا "کیوں بکتا ہے۔ بڑا عزت دار آیا کہیں سے' خود تو کہتا ہے کہ میری بیٹی رنڈی کے ہاں نوکر تھی اور اب عزت دار بنتا ہے۔ تو بھک منگا نہیں ہے تو کوئی ٹھگ یا ڈاکو ضرور ہے۔"

بڈھے پر پھر غصے کی لہر طاری ہوئی اور قریب تھا کہ وہ محرر پر دوبارہ حملہ کرے لیکن سپاہیوں نے اس کو پکڑ لیا اور انسپکٹر نے بڈھے کو دھمکایا کہ خبردار اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

بڈھے نے کہا "تو کیا آپ ایک شریف آدمی کو گالیاں دلوانے کو یہاں لائے ہیں۔ میں شہنشاہ دہلی کا خون ہوں تو ہرگز کسی کی گالی نہ سنوں گا اور اپنی جان اس کی جان ایک کر دوں گا۔"

شہنشاہ دہلی کے خون کا لفظ سن کر انسپکٹر کو ہنسی آ گئی اور اس نے محرر سے کہا "یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ تم اس کو بکنے دو۔"

اس کے بعد انسپکٹر نے بڈھے سے سوالات کرنے شروع کیے۔

"تمہاری بیٹی کی عمر کتنی ہے۔" بڈھے نے جواب دیا "وہ بیس سال کی ہے' مگر وہ میری سگی بیٹی نہیں ہے۔ میں نے اس کو پالا ہے۔ میں نے اس کی شادی کر دی تھی' مگر اس کا خاوند انفلوئنزا کی وبا میں مر گیا۔ وہ آدم جی پیر بھائی کے کارخانے میں نوکر تھا۔ میری لڑکی نے بھوپال میں یہ خبر سنی تو وہ اس کو دیکھنے بمبئی میں آئی۔ میں بھی اس کے ہمراہ آیا۔ یہاں آ کر واپسی کا خرچ پاس نہ تھا اس لئے چار مہینے سے ہم بمبئی میں ہیں۔ میری بیٹی نوکری کرتی ہے۔"

انسپکٹر نے کہا "۔ بھوپال میں کیا کام کرتے تھے۔" بڈھا بولا "میں ایک امیر کے دروازے پر چوکیدار تھا۔ میری لڑکی اسی امیر کی چھوکری تھی۔ میں نے اس کو بیٹی بنالیا تھا۔"

انسپکٹر نے پوچھا "شہنشاہ دہلی کا خون تمہارے اندر کس دن سے آیا' کیونکہ ابھی تم کہتے تھے کہ میں شہنشاہ دہلی کا خون ہوں۔ ایک ٹکے کا چوکیدار یہ کیونکر دعویٰ کر سکتا ہے۔"

بڈھے نے مسکرا کر کہا "جب سے تم یہاں آئے میں چوکیدار بن گیا۔ ورنہ تمہارے آنے سے پہلے میں شہزادہ تھا۔" انسپکٹر بڈھے کے مسکرانے سے بگڑا اور اس نے کہا "میرے آنے سے پہلے اگر تم شہزادے تھے تو اتنی جلدی چوکیدار کیونکر بن گئے۔ میرے سامنے پاگل پنے کی باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری حقیقت کو جانتا ہوں' تم بڑے ہوشیار بدمعاش ہو۔"

بڈھے نے یہ بات سنی تو پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلا' مگر اس نے بہت ضبط کے ساتھ جواب دیا "جی ہاں آپ میری حقیقت سے واقف ہیں اور میں آپ کی حقیقت سے واقف ہوں۔ میں نے ابراہیم لودھی کا گھر لوٹا تھا اس واسطے میں بھی بدمعاش ہوں۔ آپ نے میرا گھر لوٹا' لہٰذا آپ بھی بدمعاش ہیں۔"

انسپکٹر غصے سے بیتاب ہو گیا' مگر اس نے اپنے اپنے مزاج کو قابو میں رکھ کر کہا "تمہارے گھر میں کتنا سونا چاندی تھا جس کو میں نے لوٹ لیا۔" بڈھے نے جواب دیا "جتنا سونا چاندی بابر اور ہمایوں نے ابراہیم لودھی کے گھر سے لوٹا تھا' وہ سب آپ کے قبضے میں ہے۔"

انسپکٹر نے کہا "تو کیا تم بابر کی اولاد ہے؟" بڈھا بولا "میں بابر کی اولاد تھا' مگر اب چوکیدار ہوں' نہیں بلکہ آپ کا قیدی ہوں۔"

انسپکٹر نے اس کے بعد کچھ نہ کہا اور حکم دیا' اس کو حوالات میں لے جاؤ۔

(۲)

بمبئی میں مغلیہ خاندان کے ایک شہزادے رہتے تھے۔ گیروا لباس' تلوار لگائے ہوئے۔ انگریزی حکام سے بھی ان کا ملنا جلنا تھا۔ انسپکٹر صاحب نے ان کو بلایا اور کہا "ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں دہلی کے شاہی خاندان سے ہوں۔ کیا تم اس کو پہچان سکتے ہو' کیونکہ تم کو بھی دعویٰ ہے کہ میں شہزادہ دارا بخت ابن بہادر شاہ کا بیٹا ہوں۔"

یہ شخص حوالات کے قریب گیا اور بڈھے چوکیدار کو دیکھ کر بولا "جھوٹ ہے۔ یہ شہزادہ نہیں ہے۔ حوالات کے اندر سے بڈھے نے کہا' نہیں بلکہ تم شہزادے نہیں ہو۔"

انسپکٹر نے پوچھا "تم کس دلیل سے کہتے ہو کہ حوالات کا بڈھا دہلی کے خاندان سے نہیں ہے۔" وہ بولا "دلیل کچھ نہیں ہے۔ میں اپنے خاندان کے سب لوگوں کو جانتا ہوں۔"

حوالات کے اندر سے بڈھا بولا "میں تم سے عمر میں زیادہ ہوں اور مجھے اپنے خاندان کا حال تم سے زیادہ معلوم ہے۔ بتاؤ جب بہادر شاہ گرفتار ہو کر رنگون گئے تو ان کے ہمراہ کون کون گیا تھا۔" بمبئی والے شہزادے نے کہا "جواں بخت اور میں اور زینت محل اور بہادر شاہ ایک ٹمٹم میں اور زینت محل دوسری میں جواں بخت اور منزل بمنزل کلکتہ گئے۔ وہاں واجد علی شاہ نے موتیوں کا تھال نذر بھیجا' مگر انگریزوں نے اس کو پیش نہ ہونے دیا۔ کلکتہ سے ہم رنگون گئے اور بہادر شاہ کی رحلت کے بعد بمبئی چلا آیا۔"

حوالاتی بڈھا نے ہنس کر کہا "یہی جھوٹ ہے کہ بادشاہ اور زینت محل ٹمٹم میں تھے۔ دہلی کے بچے بچے کو معلوم ہے کہ یہ دونوں پالکی میں تھے۔ ایک پالکی میں جواں بخت اور زینت محل تھے' دوسری میں تاج محل تھیں۔ تیسری میں خود بادشاہ تھے' ان کے سوا کوئی شخص ان کے ہمراہ نہ تھا۔"

بمبئی والا شہزادہ کچھ گھبرا سا گیا' کیونکہ اس نے فرضی داستان اپنے شہزادہ ہونے کی بمبئی میں مشہور کر رکھی تھی اور لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔

بڈھے حوالاتی نے اور بھی چند سوالات کیے' مگر کسی کا ٹھیک جواب بمبئی والے شہزادہ نے نہ دیا۔

انسپکٹر کھڑا ہوا باتیں سن رہا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ حوالاتی بڈھا سچا ہے' اس لیے اس نے اس کو حوالات سے نکال لیا اور سامنے کرسی پر بٹھا کر حالات دریافت کرنے لگا کہ غدر سے اب تک اس پر کیا کیا گذری۔

(۳)

حوالاتی بڈھے نے کہا "میں میرزا خضر سلطان کا بیٹا ہوں جو بہادر شاہ کے بیٹے تھے اور جن کو غدر کے بعد گولی سے قتل کر دیا گیا۔ غدر میں میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ غدر کے زمانے میں مجھ کو پیچش ہو رہی تھی۔ چار مہینے لگا تار بیمار رہا۔ جس دن میرے والد گرفتار ہوئے' میں ہمایوں کے مقبرے میں تھا۔ شام کو جب خبر آئی کہ میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان وغیرہ قتل کر دیئے گئے تو میری والدہ مجھ کو اور میری چھوٹی بہن کو لے کر فرید آباد کی طرف روانہ ہوئیں کیونکہ وہاں ہمارے دو نوکروں کا گھر تھا۔

"جب ہماری بیل گاڑی بدر پور پہنچی تو میجر ہڈسن اور میرزا الٰہی بخش نے سوار لا کر ہم کو گھیر لیا۔ گاڑی کی تلاشی لی اور مجھ کو گرفتار کر لیا۔ میری صورت مردوں کی ہو رہی تھی۔ خون کے دست آتے تھے۔ والدہ نے رو رو کر کہا یہ بہت بیمار ہے۔ اس کا کچھ قصور نہیں ہے۔ یہ تو چار مہینے سے گھر میں پڑا ہوا ہے۔ ہڈسن صاحب نے کہا مگر اس کے باپ نے انگریزوں کے بچوں اور عورتوں کا قتل کرایا تھا۔ ہم اس کو قید کر کے تحقیقات کریں گے۔ اگر یہ بے گناہ ہوا تو چھوڑ دیں گے ورنہ اس کو قتل کیا

جائے گا۔ میری بہن مجھ سے بہت مانوس تھی۔ اس نے مجھ کو گرفتار ہوتے ہوئے دیکھا تو روتی ہوئی دوڑی اور مجھ کو چمٹ گئی۔ صاحب نے اس کو زبردستی ہٹا دیا اور مجھ کو ایک سوار کے پیچھے بٹھا کر دہلی کے کیمپ میں لے آئے۔

''میں والدہ اور بہن سے جدا ہوا تو وہ دونوں زار و قطار کھڑی روتی تھیں۔ والدہ نے روتے روتے اتنا کہا۔ بیٹا جان سے بچ گئے تو جلدی صورت دکھانا۔ جاؤ اللہ بیلی اللہ نگہبان۔

''تحقیقات کے زمانے میں مجھ کو سمندر خاں پنجابی سپاہی کے پاس رکھا گیا تھا جو بڑا ظالم تھا۔ میں پیچش کے سبب گھڑی گھڑی پاخانے جاتا تھا۔ جب فارغ ہو کر آتا تو وہ کہتا جاؤ۔ اس کو اپنے ہاتھ سے صاف کرو۔ پہلی دفعہ میں نے انکار کیا تو اس نے دو تین طمانچے میرے مارے۔ کمزوری کے سبب مجھ کو غش آ گیا اور تمام رات بخار بھی چڑھا رہا۔ اسی حالت میں پاخانے جاتا تھا۔ چکر آتے تھے گر پڑتا تھا' مگر مجبوراً پاخانے کو ہر دفعہ صاف کر کے باہر ڈالنے جاتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے کہا مجھ کو جنگل میں جانے کی اجازت دیجئے تاکہ صاف کرنے کی تکلیف سے بچ جاؤں تو اس ظالم نے کہا کہ شاید بھاگنے کا ارادہ ہوگا تم جنگل میں نہیں جا سکتے۔

''کھانے کو بھی بہت خراب غذا ملتی تھی جس سے پیچش بڑھ گئی تھی۔ چار دن کے بعد مجھ کو بڑے انگریز کے سامنے پیش کیا گیا۔ گامی خاں مخبر کی گواہی ہوئی جس نے بیان کیا کہ یہ لڑکا اپنے باپ مرزا خضر سلطان کے ساتھ پہاڑی پر لڑنے جاتا تھا اور لال قلعے میں جو انگریزوں کے بچے اور عورتیں قتل کیے گئے' اس وقت بھی یہ موجود تھا اور اسی نے زنانے محل سے باہر آ کر کہا تھا کہ بادشاہ نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دے دیا ہے۔

''بڑے صاحب نے یہ گواہی سن کر میری پھانسی کا حکم دیا۔ میں نے کہا اس گواہ سے یہ تو پوچھیے کہ پہاڑی پر باغی فوج کے ساتھ جاتے ہوئے یا لال قلعہ میں زنانے محل سے باہر آتے ہوئے اس نے خود مجھ کو دیکھا تھا یا سنی سنائی کہتا ہے۔

''گامی خاں نے کہا' میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا جس روز ڈگلس صاحب قلعدار مارے گئے' تم کہاں تھے۔ گامی خاں کا چہرہ فق ہو گیا اور اس نے گردن جھکا لی اور کچھ دیر کے بعد کہا میں اس روز اپنے گھر میں تھا۔ میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم خود وہاں باغیوں کے ساتھ موجود تھے اور تم ہی نے باغیوں کو ڈگلس صاحب کے قتل پر ابھارا تھا۔ میں اس وقت وہاں موجود تھا کیونکہ والدہ نے پیچش کے علاج کے لئے ڈگلس صاحب کے مہمان ڈاکٹر صاحب کے پاس مجھ کو بھیجا تھا۔ تم نے صاحب اور میم صاحب اور مہمانوں کے قتل کے بعد چاندی کا ایک گل دان اٹھا لیا تھا اور صاحب کی گھڑی بھی تم نے لی ہے۔ گامی خاں نے کہا جھوٹے ہو۔ میں وہاں نہیں تھا' مگر اس کے چہرے پر ایسی گھبراہٹ تھی کہ بڑے صاحب کو شبہ ہوا اور انہوں نے حکم دیا کہ گامی خاں کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ چنانچہ اسی وقت دور بھیجی گئی اور کچھ دیر بعد گھڑی اور گل دان لیے سپاہی آئے اور اس کے علاوہ ہزار ہا روپے کا اور بھی قیمتی سامان اس کے گھر سے نکلا۔

''صاحب نے یہ دیکھ کر گامی کو پھانسی کا حکم دیا اور مجھ کو رہا کر دیا۔ قید سے چھوٹ کر میں فرید آباد آیا' مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ والدہ اور بہن یہاں نہیں آئیں۔ ہر چند تلاش کیا' لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ چند روز فرید آباد میں ٹھہرا رہا۔ جب تندرستی ٹھیک ہو گئی تو منزل بمنزل پیدل چل کر بھوپال آیا' کیونکہ یہاں میرے والد کے دوستوں میں ایک امیر رہتے تھے۔ بھوپال پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان امیر کا انتقال ہو گیا۔ ان کے وارثوں نے بہت بے توجہی برتی' آخر میں ایک دوسرے امیر

کے ہاں چوکیداروں میں نوکر ہوگیا اور تمام زندگی اسی جگہ گذاردی۔

''انسپکٹر پولیس نے یہ بیان سن کر محرر سے کہا بیشک یہ عزت دار آدمی ہے۔ تم اس سے معافی مانگو۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اس کی بیٹی کو تلاش کیا جائے اور جب تک اس کا حال معلوم نہ ہو اس کے کھانے کا خرچ میں دوں گا۔ چار دن کے بعد معلوم ہوا کہ کسی بدمعاش نے اس کی لڑکی کو پکڑ کر کہیں چھپادیا تھا اور وہ اس سے بازاری پیشہ کرانا چاہتا تھا۔ مخبروں نے سراغ نکال لیا۔ بدمعاش کو سزا ہوئی اور شہزادہ لڑکی کو لے کر انسپکٹر کے خرچ سے بھوپال چلا آیا۔

''چلتے وقت شہزادے نے انسپکٹر کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا برا نہ مانیے گا میں نے سچ کہا تھا کہ جب بابر و ہمایوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو وہ ڈاکو تھے اور اب آپ ہیں' آج آپ شہزادے ہیں اور جب میں شہزادہ تھا۔''

☆ ☆ ☆

خانساماں شہزادہ

بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں مہاراجہ بھاؤنگر ٹھہرے ہوئے تھے۔ برسات کا موسم تھا۔ سمندر میں صبح شام طوفان برپا رہتا تھا اور پانی کی آوازوں سے مسافروں کو قریب کی بات سننی بھی دشوار تھی۔

تاج محل ہوٹل میں ایک خانساماں ستر اسی برس کی عمر کا نوکر تھا جو اپنے کام میں بہت ہوشیار اور تجربہ کار مانا جاتا تھا۔ ہوٹل والے اپنے بڑھیا مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے اسی خانساماں کو مقرر کرتے تھے۔ اس خانساماں کا نام قسمت بیگ تھا۔ اس کی دیانت داری بھی شہرۂ آفاق تھی۔ جب سے ہوٹل میں نوکر ہوا تھا' بارہا ہوٹل کے منیجر کو اس کی امانت و دیانت کے تجربے ہوئے تھے اور وہ ہوٹل کے سب نوکروں سے زیادہ اس خانساماں پر اعتماد کرتا تھا۔

ایک دن صبح کے وقت مہاراجہ بھاؤنگر نے پلنگ پر لیٹے لیٹے قسمت بیگ سے کہا ''میں نے بمبئی کے چند مہمانوں کو لنچ کی دعوت دی ہے۔ منیجر سے کہہ دینا کہ دس مہمانوں کا انتظام کردے۔'' سمندر کے پانی کا غل شور' برسات کا زمانہ' مہاراجہ بھاؤنگر کی دھیمی آواز اور بہرہ خانساماں۔ یہ حکم کیونکر اس کے کانوں تک پہنچتا' مگر قسمت بیگ کی تمیز داری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے بہرے پن کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ ہونٹوں کی حرکت سے مطلب سمجھ لیتا تھا۔

بہرے آدمیوں کی طرح کان جھکا کر بات نہ سنتا تھا۔ آج ایسے اسباب جمع ہوئے کہ قسمت بیگ مہاراجہ کے حکم کو نہ سمجھا اور اس نے ذرا پلنگ کے قریب آ کر نہایت تذبذب اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر سوال کیا کہ ''وہ جو ارشاد ہوا ہے اس کی تعمیل کی جائے گی' لیکن اگر تکلیف نہ ہو تو تھوڑی سی تفصیل اور فرمادی جائے۔'' مہاراجہ بھاؤنگر بالکل نہیں سمجھے کہ خانساماں نے ان کی بات نہیں سنی تھی اور انہوں نے خانساماں سے دوبارہ کہا کہ ''جن دس آدمیوں کو بلایا ہے وہ اعلیٰ درجے کے لوگ ہیں۔ لنچ کا اہتمام اعلیٰ قسم کا ہونا چاہیے۔'' قسمت بیگ نے بات سمجھ لی اور ادب سے کہا ''جو حکم' فرمان کی پوری تعمیل کی جائے گی۔'' اور یہ کہہ کر بڑی تمیز داری کے ساتھ پچھلے قدم چل کر سامنے سے ہٹ گیا۔

مہاراجہ بھاؤنگر دیر تک سوچتے رہے کہ انگریزی ہوٹلوں میں سب خانساماں انگریزی ادب آداب استعمال

کرتے ہیں۔ یہ بڈھا کون ہے جو پرانے زمانے کے مشرقی ادب آداب کو استعمال کرتا ہے۔ اس کا حال معلوم کرنا چاہئے۔ انہوں نے فوراً بٹن دبایا اور کمرے کا خدمتگار حاضر ہو گیا۔ مہاراج نے حکم دیا "آج جب ہم لنچ سے فارغ ہوں تو ملاقات کے کمرے میں قسمت بیگ خانساماں کو بلایا جائے۔ ہم اس سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی چاہتے ہیں۔" خدمت گار نے کہا "حضور وہ بہت بدمزاج آدمی ہے۔ صاحب لوگوں سے ہمیشہ لڑتا رہتا ہے۔ آپ اس سے پرائیویٹ بات کریں گے تو وہ آپ سے بھی گستاخی سے پیش آئے گا۔ وہ نوکری کے وقت تو بہت اچھا ہے اور صاحب لوگ اس کو پسند کرتے ہیں' لیکن پرائیویٹ وقت میں وہ بہت بدمزاج ہو جاتا ہے۔" مہاراج نے کہا "ایسا کیوں ہے؟" خدمت گار نے جواب دیا "حضور وہ کہتا ہے میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں۔" یہ سن کر مہاراجہ کو بہت تعجب ہوا اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد انہوں نے خدمت گار سے کہا "کچھ پروا نہیں۔ قسمت بیگ سے کہہ دو کہ وہ لنچ کے بعد پرائیویٹ باتوں کے لیے ہمارے پاس آئے۔" خدمت گار نے انگریزی سلام کیا اور انگریزی طریقے سے باہر چلا گیا۔

لنچ کے بعد

مہاراجہ بھاؤنگر اور "ٹائمز آف انڈیا" اور "بمبئی کرانیکل" اور "سانجھہ ورتمان" کے ایڈیٹر اور چند ہندو اور پارسی عمائد بمبئی دوپہر کا کھانا کھا کر باتوں کے کمرے میں آئے تو مہاراج نے قسمت بیگ کو بلایا۔ قسمت بیگ نہایت ادب سے حاضر ہوا اور اس نے ہندوستانی طریقے کے موافق مہاراج کو تین فرشی سلام کیے اور ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ مہاراج نے کہا "قسمت بیگ! تم کون ہو؟" قسمت بیگ دانستہ مہاراج کی کرسی کے قریب کھڑا ہوا تھا تاکہ اس کے بہرے پن کا عیب چھپا رہے اور مہاراج کی بات سن سکے۔

مہاراج کا سوال سن کر قسمت بیگ نے کہا "حضور گستاخی معاف' اس کا جواب تو آپ کو بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم سب کون ہیں اور کیوں اس دنیا میں پیدا کیے گئے ہیں۔ ہم کو بھوک' پیاس' نیند' بچپن' جوانی' بڑھاپا' تندرستی بیماری کے انقلابات میں کس غرض سے مبتلا کیا گیا ہے۔"

قسمت بیگ کی یہ عجیب تقریر سن کر سب حاضرین مبہوت ہو گئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ ایک خانساماں یہ کیسی فلسفیانہ باتیں کر رہا ہے۔ مہاراج نے مسکرا کر کہا "بے شک ہم کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں ہے' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نے زندگی کی ان مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ تم نے ایک سانس میں سب بڑے بڑے انقلابات کا ذکر کر دیا۔ اس واسطے میرا خیال ہے کہ تم میرے سوال کا جواب دے سکتے ہو۔"

قسمت بیگ نے کہا "حضور میں ایک آدمی ہوں۔ نسل کے لحاظ سے تیموری مغل ہوں۔ پیشے کے لحاظ سے تاج محل ہوٹل کا خانساماں ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بڈھا ہوں۔ طبیعت کے اعتبار سے کبھی بچہ ہوتا ہوں اور کبھی جوان۔ اخلاقی حیثیت میری ایک کامل انسان کی ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ ظلم اور بے رحمی سے بچتا ہوں۔ خدمت خلق کو اپنا مقصد زندگی مانتا ہوں۔ اگرچہ گدا ہوں لیکن دل کے تخت پر شہنشاہ ہوں۔ کچھ ارشاد ہو تو اس کا بھی جواب دوں۔"

قسمت بیگ کی مؤثر اور مسلسل اور برجستہ تقریر کا ایک دوسرا اثر پیدا ہوا اور مہاراج اپنے مہمانوں سمیت پوری

طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور بے اختیار مہاراج کی زبان سے نکلا "کیا تم تیموری شہزادے ہو؟"

قسمت بیگ کو جوش آ گیا اور اس نے کہا "شاہ زادہ نہیں ہوں آہ زادہ ہوں۔ دنیا کی مصیبتوں کی سب زدیں میں نے اٹھائی ہیں۔ تیموری خاندان تو اب مٹ چکا ہے جس نے باوجود انسان ہونے کے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی اور غلام بنا لیا تھا۔ آپ نہیں تو آپ کے باپ دادا بھی اس کے غلام تھے۔ یہ سوال فضول ہے اور آپ کے لیے تکلیف دہ ہے اور میں اس سوال کی کشمکش میں پڑنا اپنے دل کے لیے ایک آری سمجھتا ہوں جو میرے دل کو چیر رہی ہے۔"

یہ فقرہ سن کر مہاراج نے سر جھکا لیا اور سب لوگ بھی خاموش ہو کر زمین کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر کچھ دیر کے بعد خود قسمت بیگ نے کہا "انسان کو اپنی موجودہ حیثیت دیکھنی چاہیے۔ آج چونکہ میں ایک خانساماں ہوں اس لیے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ حضور میری زندگی کی تفصیل معلوم کرنی چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو ماضی پر فخر کریں یا افسوس کریں اور میں ان لوگوں میں بھی نہیں ہوں جو مستقبل کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ حضور میں ماضی کا مالک ہوں۔ حال کا مالک ہوں اور مستقبل کا بھی مالک ہوں۔ یہ آسمان بھی میرا ہے۔ یہ زمین بھی میری ہے۔ یہ سمندر بھی میرا ہے اور آپ سب لوگ جو کرسیوں پر میرے سامنے بیٹھے ہیں آپ بھی میرے ہیں اور میں خود جو آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ یہ وجود بھی میرا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بھی میرے سوا اور کسی کی نہیں ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دوسرا کوئی موجود نہیں ہے۔ میں ہی ہوں میں ہی تھا۔ میں ہی آخر تک رہوں گا۔ یہ سمندر ابل رہا ہے۔ بل کھا رہا ہے۔ جوش میں آ رہا ہے۔ برسات ختم ہو گی سردی آئے گی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تالاب بن جائے گا۔ اس کے اندر طوفان بھی میں ہی ہوں اور اس کی ٹھنڈک بھی میں ہی ہوں۔"

قسمت بیگ کی مجذوبانہ تقریر سنتے سنتے مہاراج کو ہنسی آ گئی مگر انہوں نے ہنسی کو ضبط کیا اور کہا "شہزادہ صاحب! کیا آپ میرا حکم مانیں گے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی تکلیف گوارا کریں گے۔" قسمت بیگ نے کہا "ہرگز نہیں کالج میں استاد کھڑا رہتا ہے اور شاگرد بیٹھے رہتے ہیں۔ تم شاگرد ہو اور میں استاد ہوں۔ تم سب انجان ہو اور میں دانا ہوں۔ تم سب بے خبر ہو اور میں خبردار ہوں۔ تم سب غافل ہو اور میں ہوشیار ہوں۔ تم سب ادنیٰ ہو اور میں اعلیٰ ہوں۔ تم سب بڑے ہو اور میں چھوٹا ہوں۔ تم سب امیر ہو اور میں غریب ہوں۔ تم سب فانی ہو اور میں باقی ہوں۔ تم سب بلبلا ہو اور میں پانی ہوں۔ تم سب خاک ہو اور میں ہوا ہوں۔ تم سب ایندھن ہو اور میں آگ ہوں۔ تم سب تاریکی ہو اور میں روشنی ہوں۔" یہ کہتے کہتے قسمت بیگ نے اپنی دونوں مونچھوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پکڑا اور ان کو مروڑنا اور اچھلنا شروع کیا۔ اچھلتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "میں ہوں میں۔ تم نہیں ہو۔ میں ہوں میں۔ میں ہوں میں۔ جو کچھ ہے جو کچھ تھا۔ جو کچھ ہو۔ کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ میں ہوں میں۔ میں ہوں میں۔ پھر سنو پھر کہوں۔ میں ہوں میں۔ میں ہوں میں۔"

مہاراج اور حاضرین کے جسموں پر رعشہ پڑ گیا اور ان سب پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ قسمت بیگ کی دیوانہ وار باتوں اور اچھل کود سے غیر معمولی اثر ہوا۔

کچھ دیر کے بعد قسمت بیگ' مہاراج کے قریب خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس نے نہایت ناتواں آواز میں کہا ''حضور سواری چلی گئی۔ میں ایک مرکب تھا اور سوار میرا اور تھا۔ میں ایک ہوٹل تھا اور مہمان کوئی اور تھا۔ میں ایک بوتل تھا اور شراب کوئی اور تھی۔اب سنئے مجھ بیمار لاچار خانساماں کی کہانی' سنئے:

بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میری ماں لونڈی تھی اور بادشاہ کی معتوب تھی۔ جب غدر ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو میری عمر دس سال کی تھی۔ بادشاہ نے گھبراہٹ کے وقت اپنے بیوی بچوں کا انتظام بہت ادھورا کیا تھا اور اس وقت میرا اور میری ماں کا شاید ان کو خیال بھی نہ آیا ہوگا کیونکہ میری ماں لال قلعہ کے باہر خاص بازار میں ایک مکان میں رہتی تھیں۔ مکان شاہی تھا۔ پہرے دار اور نوکر بھی بادشاہ کی طرف سے تھے۔ خرچ بھی ملتا تھا' مگر بادشاہ میری پیدائش سے پہلے میری اماں سے خفا ہو گئے تھے اور انہوں نے کبھی میری صورت نہیں دیکھی' نہ میری ماں کو قلعہ میں بلایا۔

جب دہلی کے سب باشندے بھاگے اور ولسن صاحب کمانڈر کشمیری دروازہ کے راستے شہر میں داخل ہوئے تو میری ماں نے مجھ کو اپنے ساتھ لیا اور پیدل گھر سے روانہ ہوئیں۔ نوکر پہلے ہی سے بھاگ گئے تھے۔ سواری کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میری والدہ نے سو اشرفیاں اپنے ساتھ لیں اور کوئی سامان نہ لیا۔ دہلی سے نکل کر ہم دونوں قدم شریف کی درگاہ میں گئے جو دہلی کی فصیل سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے' مگر یہ راستہ بھی ہم کو کئی کوس کا معلوم ہوا' کیونکہ نہ مجھے پیدل چلنے کی عادت تھی نہ میری ماں کو۔ مجھے یاد ہے دہلی کے باشندے ایسی گھبراہٹ میں جارہے تھے گویا قیامت قائم ہے اور سب نفسی نفسی کہتے ہوئے خدا کے پاس جارہے ہیں۔ عورتیں کپڑوں کی بقچیاں سروں پر رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھ پکڑے جارہی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ وہ ان کو کھینچتی تھیں اور بچے چل نہ سکتے تھے۔ مردوں کا بھی یہی حال تھا۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ سب اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔

قدم شریف میں جا کر ہم ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں بیٹھ گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ رات ہوئی۔ مجھے بھوک لگی مگر وہاں کچھ کھانے کو نہ تھا۔ میری ماں نے مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور تسلی دلاسے کی باتیں کرنے لگیں۔ شہر سے بندوقوں کی آوازیں اور شہر والوں کا غل شور سن سن کر میں گھبرایا جاتا تھا اور میری والدہ بھی سہمی بیٹھی تھیں' یہاں تک کہ میں اسی بھوک کی حالت میں سو گیا۔

صبح ہندوستانی فوج کے سپاہی قدم شریف میں آئے اور انہوں نے لوگوں کو پکڑنا شروع کیا۔ میری ماں کو بھی گرفتار کر لیا اور ایک پوربیہ ہندو ان کو اپنے ساتھ پہاڑی پر لے گیا جو قدم شریف سے کئی میل دور تھی اور ہم دونوں جب پہاڑی پر پہنچے تو ہمارے پاؤں خونم خون ہو گئے تھے۔ شام کو ہمیں انگریز افسر کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے میری ماں سے کچھ سوالات کئے۔ مجھے یاد نہیں انگریز نے کیا کہا اور میری ماں نے کیا جواب دیا۔ اتنا یاد ہے کہ انگریز کو میری ماں نے بتا دیا کہ وہ بادشاہ کی لونڈی ہے اور بچہ بادشاہ کا بیٹا ہے اور انگریز نے حکم دیا کہ ان دونوں کو آرام سے رکھا جائے۔ آرام یہ تھا کہ ہم کو ایک چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا جس میں ہم رات دن پڑے رہتے تھے اور دو وقت کھانا ہم کو مل جاتا تھا۔

جب دہلی میں انگریزی انتظام قائم ہو گیا تو ہم دونوں کو چاندنی محل میں جو جامع مسجد کے قریب ایک محلہ تھا' بھجوا دیا گیا جہاں ہمارے خاندان کے اور لوگ بھی آباد ہو گئے تھے۔ میری والدہ کے نام دس روپے ماہوار گذارے کے

مقرر کر دیئے گئے اور میں نے اپنی والدہ کے ساتھ بچپن سے جوانی تک جیسی جیسی مصیبتیں اٹھائیں' بس میرا ہی دل جانتا ہے۔

چاندنی محل کے قریب ایک خانقاہ تھی اور میں وہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ خانقاہ میں ایک درویش رہتے تھے۔ ان کی باتیں سنتا تھا اور ان کا مجھ پر بہت اثر ہوتا تھا۔ انہی کی باتوں سے مجھے اپنی اور کائنات کی ہر چیز کی حقیقت کا علم ہوا اور اس وقت جو کچھ میں عرض کر رہا تھا' یہ بھی انہیں کی صحبت کا اثر ہے۔

والدہ نے خاندان ہی کے اندر میری شادی بھی کر دی' اولاد بھی ہوئی مگر وہ زندہ نہیں رہی۔ میں نے دہلی میں ایک خانساماں کی شاگردی اختیار کی اور یہ کام سیکھا جواب کر رہا ہوں اور جب میری والدہ اور بیوی کا انتقال ہو گیا تو میں دہلی سے بمبئی چلا آیا اور یہاں مختلف لوگوں کی نوکریاں کیں۔ ہوٹلوں میں بھی رہا اور اب مدت سے تاج محل ہوٹل میں ہوں۔

بچپن سے میرے کان میں کچھ خرابی ہو گئی جو آج تک باقی ہے' مگر میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی میرے بہرے پن کو سمجھ نہ سکے کیونکہ مجھے اس عیب سے بہت شرم آتی ہے۔

خانساماں کی یہ بات سن کر مہاراج نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا ''قسمت بیگ نام کس نے رکھا۔''

خانساماں نے کہا ''میری قسمت نے' ورنہ میری ماں نے تو میرا نام تیمور شاہ رکھا تھا' مگر جب میں دہلی سے بمبئی آیا تو ہر شخص کو میں نے اپنا نام قسمت بیگ بتایا۔''

مہاراج نے کہا ''چلو میں تم کو بھاؤ نگر لے چلوں۔ جو تنخواہ یہاں ملتی ہے اس سے دگنی تنخواہ دوں گا اور تمہاری باتیں سنا کروں گا۔ کوئی کام نہیں لوں گا۔''

یہ بات سن کر قسمت بیگ نے جھک کر تین فرشی سلام مہاراج کو کیے۔ پھر کہا ''یہ عین بندہ نوازی ہے' لیکن جس نے اس دنیا کے انقلاب کو سمجھ لیا وہ قناعت کے دروازے پر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک دروازے کو پکڑ اور مضبوط پکڑ' دربدر بھٹکتا نہ پھر۔ اس ہوٹل میں میری عزت بھی ہے اور میری مزاج داری بھی ہے۔ صاحب لوگ بھی میری بدمزاجیوں کو برداشت کر لیتے ہیں۔ ضرورت کے موافق ہر چیز موجود ہے۔ آپ ہی فرمایئے میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کیوں کروں اور ایک جگہ کو چھوڑ کر جہاں کوئی تکلیف نہیں ہے' آپ کے ہاں کیوں آؤں۔''

مہاراج نے آفریں کہی اور ایک ہزار روپے کا چیک لکھ کر دیا۔ کہا کہ اس کو اپنے خرچ میں لانا' آئندہ بھی ہر سال ہوٹل کے منیجر کی معرفت ہزار روپے تم کو مل جایا کریں گے۔ قسمت بیگ نے پھر سلام کیا اور چیک لے کر رونے لگا اور پچھلے قدم ہٹ کر باہر چلا آیا۔

معلوم نہیں اس کو رونا کیوں آیا اور اسے کیا بات یاد آ گئی۔

☆ ☆ ☆